قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک
سالانہ
پاکستان ـــــ ۴۸ روپے
غیر ممالک ـــــ ۱۱۰ روپے

ٹیلیفون

خط و کتابت
ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ
۴
چار روپے

نمبر ۷ | جولائی ۱۹۸۷ء | جلد (۴۰)

فہرست

۱۔ لمعات ۔ (آل ورلڈ مسلم کانفرنس ۔ ج) ۲

۲۔ معاشرتی نظم و ضبط ۔ اسلام کی نظر میں ۷
(ثریا عندلیب)

۳۔ فتوٰی بنام فتوٰی ۔ (حسن عبّاس رضوی) ۱۳

۴۔ حقائق و عبر ۔ ۲۱
۱۔ تیری آواز مکّے اور مدینے
۲۔ جعلی اور جھوٹی احادیث
۳۔ عائلی قوانین اور جماعت اسلامی
۴۔ مروّجہ نظامِ زکوٰۃ
۵۔ شریعت بل کا "پکوڑا"
۶۔ علماء حضرات کے عید کے دن کے مشغلے

۵۔ باب المراسلات ۔ (صحافتی بد دیانتی) ۲۶

۶۔ کعبہ کس منہ سے جاؤ گے ؟ ۲۸

۷۔ پرویز صاحبؒ کا پیغام ۳۰
محمد اکرم راٹھور ۔ کراچی

۸۔ خدا کی گرفت ۵۰

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر: شیخ عبدالحمید، مقامِ اشاعت: ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور ۔ مطبوعہ: النور پرنٹرز، ۲/۴ فیصل نگر ۔ ملتان روڈ ۔ لاہور ۲۵۔

ملّیات

آل ورلڈ مسلم کانفرنس۔ حج

جب سے انسان نے آنکھ کھولی ہے وہ اسی تگ و تاز میں غلطاں و پیچاں رہا کہ وہ کون سی صورت پیدا کی جائے کہ اس دنیا میں انسان امن و سلامتی سے رہ سکیں۔ اُسے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ان گنت تجارب کی بھٹیوں اور سنگلاخ وادیوں سے گزرنا پڑا۔ لیکن وہ مقصود حاصل نہ کر سکا۔ زمان و مکاں ہر آن بدلتے رہے۔ نظریاتِ حیات میدانِ تصادم میں برسرِ پیکار رہے۔ THESIS، ANTITHESIS اور SYNTHESIS کا عمل عقلِ محض کی ابلہ فریبیوں میں عافیت کوش رہا۔ اس طرح انسان اپنے ہی ہاتھوں سراب کا شکار ہوتا رہا۔ مدت کے بعد پہلی جنگِ عظیم کے اختتام پر اقوامِ مغرب نے 'جمعیۃ الاقوام' (LEAGUE OF NATIONS) کی طرح ڈالی جو کردار اور عمل کے فقدان کی وجہ سے بری طرح ناکام ہوئی۔ علامہ اقبالؒ نے تو اسے کفن چوروں کی جماعت کہا تھا۔ اس کی ناکامی کی وجہ (MR: REEVES) اپنی کتاب (ANATOMY OF PEACE) میں لکھتا ہے کہ "لیگ آف نیشنز" کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ بین الاقوامیت کے غلط تصور پر قائم ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا کی مختلف قوموں کے نمائندوں کو یک جا کر کے باہمی بحث و تمحیص سے دنیا کا امن قائم رکھا جا سکتا ہے۔ اس ناکام تجربے کے بعد "لیگ آف نیشنز" کی جگہ یعنی اس کا نام بدل کر (UNITED NATIONS ORGANISATION) اقوامِ متحدہ کی تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس طرح سے یہ ناکام ہوئی ہے۔ اس کی مثال بھی تاریخ میں نہیں ملتی۔ وہ اس طرح کہ اس کی ایک سیکوریٹی کونسل ہے جس کے پندرہ مستقل رکن ہیں۔ ان میں سے پانچ یعنی امریکہ، برطانیہ، فرانس، روس اور چین کو حقِ استرداد (VETO) کا اختیار دیا ہوا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی معاملہ سیکیوریٹی کونسل منظور کر دے تو ان میں سے کوئی رکن بھی اسے رد (VETO) کر سکتا ہے جس سے تمام کاروائی منسوخ ہو جاتی ہے۔ گویا ان کا یہ عمل اُن کے اپنے وجود کی نفی ہے۔ ظاہر ہے جو جماعت اپنے وجود کی خود نفی کر دے۔ منطقی طور پر (VIRTUALLY) اُس تنظیم نے

سے کے پورے ادارے کو کالعدم کرنے کے خود اسباب پیدا کر رکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دنیا کے مسائل حل کرنے میں بڑی طرح ناکام رہی ہے۔ دوسری اقوام کو تو چھوڑیئے، مسلمانوں کا کوئی مسئلہ آج تک حل نہیں ہو سکا۔ کشمیر کا مسئلہ ۱۹۴۷ء سے اس کے ایجنڈا پر ہے اور ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ ایران عراق جنگ بند نہیں کرا سکی۔ اسرائیل سے عرب علاقے خالی نہیں کرا سکی۔ بھارت میں مسلمانوں کے مستقل سفاکانہ قتلِ عام کا کوئی سدِباب نہیں کر سکی۔ افغانستان آگ کے شعلوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس کا کوئی فیصلہ نہیں کرا سکی۔ یہ چند مسائل ہیں جن کا تعلق عالمِ اسلام سے ہے۔ باقی علاقوں کے مسائل کا بھی کوئی خاطر خواہ حل نہیں ہو سکا۔ کافی عرصہ ہوا لندن کے اخبار "ڈیلی میل" نے لکھا تھا کہ جمعیتِ اقوام اپنی موجودہ ہیئت میں امنِ عالم کے لیے سخت خطرہ کا موجب ہے اس لیے اسے فوراً ختم کر دینا چاہیے"، اور اس کی وجہ (MR: REEVES) کے الفاظ میں یہ ہے کہ "ہمارے سامنے جو مسئلہ ہے۔ وہ قوموں کے باہمی تعلقات کا مسئلہ نہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم نے انسانی معاشرہ میں جو خلجان پیدا کر رکھا ہے۔ اُسے کس طرح دُور کیا جائے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ خلجان نیشنلزم یا انٹرنیشنلزم کے ذریعے دُور نہیں ہو سکتا۔ جس چیز کی ضرورت ہے وہ نوعِ انسانی کی برادری ہے نہ کہ بین الاقوامیت" یعنی یہ وہی چیز ہے۔ جسے علامہ اقبال نے کہیں پہلے ان الفاظ میں کہا تھا کہ

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام — پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود — اِسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم

مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم

یہ حشر ہوا اُس نظریۂ حیات کا جو وحی کی راہنمائی سے محروم تھا اور صرف عقل کے گھوڑے پر سوار تھا۔

لیکن صدیوں پہلے وحدتِ آدم کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے مرکزِ انسانیت یعنی خانہ کعبہ کو از سرِ نو تعمیر کیا۔ کیونکہ مرکز کے بغیر انسانوں کا ایک برادری بننا اور ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا ناممکن ہے۔ چنانچہ جب تعمیرِ کعبہ مکمل ہو چکی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے کہا وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ ۲۲/۲۷ "تمام نوعِ انسانی کو یہاں جمع ہونے (حج) کا اعلان کر دے" اور اس کی غائیت یہ بیان فرمائی کہ لِیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ ۲۲/۲۸ "تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیں کہ نظامِ خداوندی کس طرح عالمگیر انسانیت کی منفعت بخشیوں کا ضامن ہے۔"

نصوصِ قرآنی سے حج کی جو تفصیلات ظاہر ہوتی ہیں وہ اس طرح ہیں کہ تمام دنیا کے اِنسان بلا تفریق رنگ و نسل اور بلا امتیاز وطن و زبان، جو اس نصب العین پر ایمان رکھتے ہوں کہ دنیا میں کس[illegible]

دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق نہیں۔ محکومیت صرف خُدا کے قانون کی جائز ہے، جو انسانی تقاضوں کا ترجمان ہے، اپنے اپنے ملکوں سے اپنے نمائندے چُنیں۔ یہ نمائندے اپنے میں سے ایک منتخب کردہ امیر کی زیرِ قیادت، مرکزِ وحدتِ انسانیت، یعنی بیتُ اللہ کی طرف روانہ ہوں۔ عرفات کے میدان میں ان تمام نمائندگان کا باہمی تعارف ہو۔ پھر یہ تمام اُمرا اپنے میں سے ایک امیرالامرا کا انتخاب کرلیں اور مختلف ممالک کے احوال وظروف کو سامنے رکھ کر باہمی مشاورت سے ایسا پروگرام مرتب کرلیں جو آئندہ سال کے لیے اصولی طور پر بطور مشترکہ پالیسی اختیار کیا جائے۔ اس کو آجکل کی اصطلاح میں "سالانہ ترقیاتی پروگرام" ANNUAL DEVELOPMENT PROGRAMME کہا جاتا ہے۔ پھر ان کا منتخب کردہ امام اپنے خُطبۂ حج میں اسی پروگرام کا اعلان کردے جو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ جائے۔ اس کے بعد یہ تمام نمائندگان، مقام منیٰ میں جمع ہو کر اس اصولی پروگرام کی تفصیلات وجزئیات پر غور کریں۔ اور یہ سوچیں کہ ایک دوسرے ملک پر ان کے (PROS AND CONS) کا عملی اثر اور ردِ عمل کیا ہوگا۔ وہاں باہمی مذاکرات بھی ہونگے، اور دعوتیں اور ضیافتیں بھی ہونگی جس کے لیے بَهِيْمَةُ الْاَنْعَام ۲۲/۲۸ کا ذبیحہ تجویز کیا گیا ہے۔ جسے عرفِ عام میں قربانی کہتے ہیں۔ آخر میں یہ نمائندگان طوافِ کعبہ کے بعد اپنے اپنے ملکوں میں واپس آجائیں گے۔ اور اس طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے اپنے لوگوں اور نظم ونسق کو چلائیں گے۔ یہ ہے وہ عملی طریقہ جو قرآنِ حکیم نے تمام نوعِ انسانی کو ایک اُمتِ واحدہ بنانے اور اُن کے تمدنی مسائل کا حل تجویز کرنے کے لیے بتایا ہے۔

قرآنِ حکیم کی رو سے اس اجتماع کی مکمل کارروائی کے لیے کم از کم تین مہینے بتائے ہیں۔ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۲/۱۹۷ اس سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔

یہیں سے اقوامِ متحدہ نے بھی اپنے سالانہ اجلاس کے لیے کم از کم تین مہینے مقرر کر رکھے ہیں۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل

فریضۂ حج کا تقرار تقاضا ہے کہ اپنے اپنے ممالک کو لوٹ کر سب کچھ بھولنا نہیں بلکہ تم جہاں کہیں بھی ہو دنیا کے کسی گوشہ میں بھی ہو، زندگی کے کسی شعبہ میں مصروفِ تگ وتاز ہو اپنی توجہات کا رُخ اسی مرکز کی طرف رکھو۔ اور جو پروگرام وہاں سے مرتب کر کے لائے تھے۔ اُس کا احترام کرنا ہوگا اور اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہوگا، کیونکہ آئندہ سال اپنی PROGRESS REPORT وہیں جا کر پیش کرنا ہونگی۔ اسی لئے خانہ کعبہ کو قبلہ کہا گیا ہے جس کو ہر وقت اپنے سامنے رکھا جائے۔ اگر کسی وجہ سے تکمیل پروگرام (A-D-P) میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو اس کے (BOTTLE NECKS) حج کے دوران بیان کرنا ہوں گے تاکہ ان کا تدارک کیا جا سکے۔ اسی لیے حج کا مقصود قرآنِ حکیم میں خاص طور پر دو مقامات پر مختصراً بیان کر دیا گیا ہے۔ ایک

لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ ۲۲/۲۸ تاکہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اس میں اُن کے لیئے کس قدر فائدے ہیں اور اُس کی غائت قِيَامًا لِّلنَّاسِ ۵/۹۷ یعنی اس سے دُنیا میں انسانیت قائم رہے۔

تصریحاتِ بالا سے ظاہر ہے کہ حج سے مقصود جمعیتِ آدم" کی تشکیل تھا۔ لیکن آج حج چند رسوم کا بے جان اور بے مقصد مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔ مسلمانوں کی لامرکزیت کی وجہ سے عالمِ اسلام چاروں طرف سے مصائب و نوازل سے گھرا ہوا ہے۔ غیر خدائی قوتیں ان کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کئے ہوئے ہیں کہ دنیا کے نقشہ پر کہیں ان کا نشان رہنے نہ پائے۔ لیکن ملتِ اسلامیہ تختۂ غفلت پر سوئی ہوئی خراٹے لے رہی ہے۔ پڑوسی ملک میں مسلمانوں پر جو گزر رہی ہے۔ آسمان کی آنکھ بھی اُس پر پُرنم ہے۔ یہ ایک دن کی بات نہیں جب سے پاکستان بنا ہے بھارت کے مسلمانوں کا سکھ کا سانس لینا بھی ایک داستانِ پارینہ بن چکا ہے۔ ہندوؤں کے ہاتھوں بچوں کا بہیمانہ قتل، عورتوں کی عصمت دری مسلمانوں کی املاک کی تباہی معمول بن چکا ہے۔ مسلمانوں کی عبادت گاہیں جلائی جا چکی ہیں۔ یہاں تک کہ امام عبداللہ بخاری جو جامعہ مسجد دہلی کے امام ہیں۔ اُنہوں نے بطورِ احتجاج جامعہ مسجد کو نماز کے لیے بند کر دیا ہے۔ مبادا نمازیوں کو اس کے اندر قتل کر دیا جائے۔ میرٹھ اور دہلی کے علاقہ میں تو قیامت برپا ہے۔ سینکڑوں کی تعداد میں بے گناہ مسلمان قتل ہو چکے ہیں۔ ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ ہندو عوام تو کجا پولیس بھی ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں کا بیدردی سے خون بہا رہی ہے۔ اُنکا جرم یہی ہے کہ وہ کہتے ہیں۔ رَبُّنَا اللّٰهُ ۲۲/۴۰ "ہمارا رب اللہ ہے" وہ قرآن کے الفاظ میں خدا سے فریاد کر رہے ہیں۔ اور اللہ مومنوں کو حکم دے رہا ہے کہ۔

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے؟ حالانکہ کتنے ہی بے بس مرد اور عورتیں اور بچے ہیں جو (ظالموں کے ظلم و تشدد سے عاجز آکر) فریاد کر رہے ہیں۔ خُدایا ہمیں اس بستی سے جہاں کے باشندوں نے ظلم و تشدد پر کمر باندھ لی ہے نجات دِلا اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا کارساز بنا دے اور اپنی طرف سے کسی کو ہماری مددگاری کے لیے کھڑا کر دے" ۴/۷۵

پاکستان تو کجا دنیا کا کوئی ملک ایسا ہے جو خدا کے متذکرہ حکم کے تحت بھارت کے مسلمانوں کی مدد کو پہنچ سکے؟ یہ وہی معاشرہ یعنی مرکزِ ملت (CENTRAL AUTHORITY) ہو سکتا تھا جس کی خصوصیت اقبالؒ کے الفاظ میں یہ ہوتی کہ ؎

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

اسلامی معاشرہ یعنی مرکزِ ملت کی حیثیت آنکھ جیسی ہوتی ہے۔ اگر انسانی جسم کے کسی حصہ میں تکلیف ہو تو آنکھ کو چین نہیں۔ اسی طرح اگر دنیا کے کسی حصہ میں کسی ایک مسلمان پر بھی ظلم ہو رہا ہو تو مرکزِ ملت حرکت

میں آجاتا ہے اور ظلم کو کیفرِ کردار تک پہنچاتا ہے۔ لیکن افسوس! اس وقت وہ مرکزِ ملت کہاں جو قرآن کے قانون اور حکم کی قوتِ نافذہ بنتا!

قوموں کے لیے موت ہے مرکز سے جدائی ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے خدائی

ہماری لامرکزیت ہمارے زوال اور انحطاط کا سبب ہے۔ اس لیے حج چند رسوم کا بے جان اور بے مقصد مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔ مسلمانوں کے نمائندے مختلف مقامات پر کانفرنس منعقد کرنے پر ہی اکتفاء کیے ہوئے ہیں۔ عملی طور پر کچھ نہیں ہو سکا۔ ان کی بے عملی کا ثبوت یہ ہے۔ کہ یہ ایمان اور عراق کی جنگ بند نہیں کرا سکے۔ لیکن ؎

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

یہ نمی تمسک بالقرآن سے پیدا ہوگی۔ اور پھر جب ہم نے اپنے اللہ سے بھلایا ہوا عہد استوار کر لیا اور پھر اسی مرکز کو زندہ کر دیا، جس کی زندگی سے تمام نوعِ انسانی کی زندگی وابستہ ہے، اقوامِ عالم کی امامت ہمارے حصے میں آجائے گی۔ ہماری زندگی کے چشمے کی سوتیں عرفات کے ممبر سے پھوٹیں گی اور اسی سے ہماری کشتِ حیات سرسبز و شاداب ہوگی۔ آج مسلمانوں کو حج کا فریضہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

لیکن یہ سب کچھ اُس مرکز کے ساتھ وابستگی سے ہوگا جس کی خصوصیت یہ ہے کہ

قوم را ربط و نظام از مرکزے روزگارش را دوام از مرکزے
راز دارد رازِ ما بیت الحرام سوزِ ما ہم سازِ مابیت الحرام

ثریا عندلیب

معاشرتی نظم وضبط ـــــ اسلام کی نظر میں

اسلامی یعنی قرآنی معاشرہ کے قیام واستحکام کے لیے جو خصوصی عوامل درکار ہوتے ہیں، ان میں معاشرتی نظم وضبط کی حیثیت ایسی بنیادی ہے جس کو نظرانداز کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس لیے کہ جس معاشرے کے افراد کے طور واطوار نظم وضبط سے لاتعلق اور بیگانہ ہوتے ہیں، ان کے درمیان وہ اتحاد واتفاق راہ نہیں پا سکتا جس کی بنیاد پر انسانیت پھلتی پھولتی ہے۔ نظم وضبط کی صفات اختیار کیے بغیر افرادِ معاشرہ اس وحدت کے حامل نہیں ہو سکتے جو خالقِ حقیقی نے نوعِ انسان کے لیے لازم قرار دی ہے اور ہمیشہ رہنے والے ضابطۂ حیاتِ انسانی میں یہ اعلان کیا ہے کہ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳) درحقیقت نظم وضبط انسانی زندگی کا ایسا اعلیٰ ترین اور منفعت بخش اصول ہے جو افراد کو اپنی انفرادیت اور خودی کی ہمراہی میں اجتماعیت کی منزل کی طرف لے جاتا اور ایک قوم ایک اُمت کی شکل میں ڈھالتا ہے۔

قرآن حکیم کے فرمان کے مطابق اگر ہم اس وسیع وعریض کائنات کا مشاہدہ کریں اور اس کے متعلق غور وفکر سے کام لیں تو نظم وضبط کی کارفرمائی عظیم کُرّوں سے لے کر انتہائی چھوٹے چھوٹے ذرّوں تک نظر آتی ہے۔ وقتِ معیّنہ کے مطابق دن رات کا آنا جانا، موسموں کا تغیّر وتبدّل اور ایک ضابطے کے مطابق چلتے چلے جانا، اجرامِ سماوی کا ایک تنظیم میں اپنے مخصوص اور مقررہ راستے پر رواں دواں رہنا، اسی طرح سطحِ ارض کی تخلیقات اور سطحِ ارض کے نیچے کی موجودات کا ایک نظمِ مسلسل کے تحت رہنا۔ یہ وہ مشاہدات ہیں۔ جن سے افرادِ نسلِ انسانی کو جہاں خالقِ کائنات کی ہستی اور اس کی عظیم تخلیقی وتنظیمی قوتوں کا پتہ چلتا ہے، وہاں نظم وضبط کی اہمیت، اور اس کی حیرت انگیز کارکردگی بھی واضح ہوتی ہے۔ جب یہی نظم وضبط انسانی معاشرے کا حصہ بنتا ہے تو پھر وہ صالح جماعت وجود میں آتی ہے جسے پروردگارِ عالم نے ایسی منظم سیسہ پلائی دیوار کے مشابہ قرار دیا ہے کہ جس میں کوئی دراڑ نہیں پڑتی کوئی شگاف نہیں ڈالا جا سکتا۔ كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (۶۱/۴)

معاشرتی نظم وضبط پر کاربند رہنے والے افرادِ معاشرہ ایک مالا میں پروئے ہوئے موتیوں کی طرح مجتمع رہتے ہیں اور بکھرنے نہیں پاتے، اسی کو نظم کہتے ہیں۔ اس طرح ایک اُمت بن کر مقررشدہ ضابطوں کے مطابق

زندگی کے فرائض سے عہدہ برآ ہوتے رہنے کا نام ضبط ہے۔ یوں نظم وضبط کے باہم ملنے سے افراد میں وہ حسن کردار پیدا ہوتا ہے جو زندگی کو تابندگی عطا کرتا ہے۔

اس خدائی اصول کے طریق کار کو اپنانے سے ہماری معاشرتی زندگی یقینی طور پر انتشار و خلفشار سے محفوظ رہتے ہوئے امن وسکون کا گہوارہ بن سکتی ہے۔ اگر قلب و ذہن کی آمادگی وکشادگی کے ساتھ ہمارا یہ ایمان ہو کہ اسلامی زندگی امت یا قوم بن کر رہنے کی زندگی ہے، تو پھر نظم وضبط کے اس تقاضائے حق کو پس پشت نہیں ڈالا جاسکتا کہ ہم سب افراد معاشرہ قاعدہ وقانون کے تحت ایک دوسرے کے ہو کر معاشرتی امور انجام دیں۔ کہ محض اپنے نفس کی تسکین کے لیے اپنے اپنے مفاد کے پیچھے دوڑتے اور چلاتے رہنے کی زندگی مسلمان کی زندگی نہیں۔

رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِينَ خاتم المرسلین حضور نبئ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ پوری امت مسلم ایک جسم کی مانند ہے۔ آپؐ نے جماعت مومنین کے درمیان تنظیم واتحاد کی مثال واضح کرتے ہوئے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر مضبوطی سے کھینچا۔ آپؐ نے فرمایا کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے سے محبت والفت اور رحمت ونرمی کا سلوک کرنے میں ایک جسم کی طرح ہیں کہ جب اس کا ایک حصہ تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو سارا جسم اس تکلیف کو محسوس کرتا ہے۔ اس فرمان نبوی سے مقصود یہ ہے کہ تمام معاملات زندگی اور معاشرتی امور میں افراد معاشرہ کو قوائے جسم کی طرح کے نظم وضبط اور تعلق خویش سے کام لینا چاہیئے۔ سورہ آل عمران میں ارشاد خداوندی ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ ۳/۲۰۰ یعنی "اے افراد جماعت مومنین! تم خود بھی ثابت قدم رہو اور دوسروں کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرو۔ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رہو۔ اور اس طرح سب مل کر قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ تقوی شعار بنو تاکہ تم کامیاب زندگی بسر کر سکو۔" اس آیۃ کریمہ سے یہ صداقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ مسلمانوں کی زندگی استقامت، تنظیم اور اتحاد پر مبنی ہوتی ہے۔ اور اسلام کی نظر میں معاشرتی نظم وضبط سے مراد یہی ہے کہ تمام اہل اسلام ایمان محکم اور یقین کامل کے ساتھ تنظیم واتحاد کی راہ پر گامزن رہیں اور کسی موقع پر بھی نظم وضبط یعنی قواعد وضوابط کا دامن ان کے ہاتھ سے چھٹنے نہ پائے۔

قرآن حکیم مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے۔ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ۳/۱۰۳ تم اللہ کے اس انعام کو یاد کرو کہ (ایک وقت وہ تھا) جب تم الگ الگ تھے اور ایک دوسرے کے دشمن تھے پھر اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل کر رہنے لگے۔ اس طرح تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی

بن گئے" اور پھر قرآن نے یاد دلایا کہ وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا۔ تم تباہی اور بربادی کے جہنم کے کنارے تک پہنچ گئے تھے کہ اللہ نے تمہیں گرنے سے بچا لیا۔ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۳/۱۰۳ اس طرح اللہ اپنے قوانین کو تمہارے فائدے کے لیے کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ زندگی اور کامیابی کا سیدھا راستہ تمہارے سامنے آجائے۔ ان آیاتِ بیّنات سے یہ حقیقت ظاہر ہے کہ دلوں کی وابستگی کے بغیر افرادِ معاشرہ وہ امّتِ واحدہ نہیں بن سکتے جو جذبۂ اخوّت پر استوار ہوتی ہے۔ اور جذبۂ اخوّت کے بغیر لوگوں کے درمیان وہ معاشرتی نظم وضبط قائم نہیں ہو سکتا جو نظامِ اسلامی کا جزوِ لازمی ہے۔ جس طرح اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ بجانے سے کوئی سُر تال پیدا نہیں ہوتا، اسی طرح اپنا اپنا مفاد پیشِ نظر رکھنے سے معاشرہ کیلئے کوئی فائدہ بخش کام سرانجام نہیں پاتا۔ برعکس اس کے جب افرادِ معاشرہ تنظیم و اتحاد کے ساتھ مل جُل کر قدم بڑھاتے ہیں تو ایسے ایسے کام کر لیتے ہیں جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس کی بیّن مثال وطنِ عزیز کا حصول ہے جو ملّتِ اسلامیہ کے قائدِ اعظم کی زیرِ قیادت یک مُشت ہو کر مثالی نظم وضبط کے نتیجے میں وجود میں آیا۔ مگر یہ تصویر کا ایک رُخ ہے بلکہ تھا۔ دوسری طرف جب معاشرے کے لوگ زندگی کے اس اصل الاصول کو بھول جاتے ہیں۔ اور ان کے کردار کو نظم وضبط سے کوئی سروکار نہیں رہتا، تو پورا معاشرہ نفسا نفسی، افراتفری اور بھینا جھپٹی کا شکار ہو جاتا ہے۔ تصویر کا یہ دوسرا رُخ روز ہمارے سامنے رہتا ہے۔ اور ہمیں آئینہ دکھاتا ہے۔ جب مفاد خویش ہی پیش پیش رہے اور اس کے حصول کے لیے کسی قاعدے قانون کی پروا نہ کی جائے، اپنے سامنے والے کو دھکا دے کر خود آگے نکل جانے میں کوئی عار نہ ہو، صف بستہ ہونے کی پابندی گوارا نہ ہو تو پھر نظم وضبط کی حیثیت پرِ کاہ کے برابر نہیں رہتی ایسی ذہنیت کے حامل افراد حوصلہ و پامردی اور عزم و استقلال سے کام لے کر اپنے فرائض کی کما حقہٗ ادائیگی کے بجائے بے قابو و بے ہمت ہو کر دوسروں کی حق تلفی کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں معاشرے میں انتشار بے یقینی، دل شکستگی و مایوسی کی کیفیت کیسے نہ پیدا ہو!! اس انسانیت سوز صورتِ حال سے دوچار معاشرہ کیونکر پنپ سکتا ہے!

بانیٔ پاکستان بابائے قوم قائدِ اعظمؒ نے فرمایا تھا "ہم مسلمان ہیں، ہمارا خدا ایک، رسول ایک اور کتاب ایک ہے۔ پس لازم ہے کہ ہم ایک امّت بن کر قدم بڑھائیں"۔ قائدِ اعظم کے پیغام کے مطابق اُمّت کا ایک ہونا ہی اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔ اس وحدت کی عملی تربیت نظم وضبط اختیار کرنے سے ہی ملتی ہے۔ اس کے اندر اُس اتحاد و اتفاق اور ہم آہنگی و یک رنگی کا سبق پوشیدہ ہے جو امت کو فرقہ بندی و گروہ سازی کی لعنت سے بچاتا اور تشتّت و افتراق کی دلدل سے محفوظ رکھ کر اس صراطِ مُستقیم پر گامزن کرتا ہے

جس کے متعلق سورہ انعام میں کہا گیا ہے۔ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۶/۱۵۳ "یاد رکھو! میرا یہی ایک سیدھا راستہ ہے پس تم سب اس کا اتباع کرو۔ اس کے سوا دوسرے راستوں پر نہ چلو وہ راستے تمہیں اس صراط مستقیم سے متفرق اور پراگندہ کر دیں گے۔ اللہ نے تمہیں اس کا حکم دیا ہے تا کہ تم تقویٰ شعار رہ سکو۔"

جیسا کہ ہم جانتے ہیں دین اسلام ایک اجتماعی نظام کا نام ہے جو انسانی زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہے کہ یہی وہ رشتہ ہے جو منتشر افراد کو ایک اجتماع کی صورت دے کر انہیں ملت یا اُمت بناتا ہے۔ مگر یہ اجتماعیت نظم و ضبط کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ یہ نظم و ضبط خود آئین و قانون کا پابند ہوتا ہے۔ اجتماعی زندگی آئین ہی کی رو سے متشکل ہوتی اور اسی کے سہارے قائم رہتی ہے۔ معاشرے میں رہتے ہوئے ہر فرد ہر شعبۂ زندگی میں قانون کے مقرر کردہ قواعد و ضوابط، حدود و قیود، اوامر و نواہی اور احکامات و فرامین کے تابع رہ کر کام کرے۔ یہ ہے نظم و ضبط کی عملی صورت۔ اس کے برخلاف جو قوم بے آئینی و لاقانونیت پر اُتر آتی ہے، وہ قوم نہیں رہتی۔ ہاں بکھرے ہوئے پتوں کی طرح منتشر افراد رہ جاتے ہیں۔ حکیم الامت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

ملتے را رفت چوں آئین ز دست — مثلِ خاک اجزائے اُو از ہم شکست
ہستئ مسلم ز آئین است و بس — باطنِ دینِ نبیؐ این است و بس

یعنی ملت کوئی بھی ہو جب اس میں آئین کی وحدت نہ رہے تو اس کے افراد ریت کے ذروں کی طرح منتشر ہو جاتے ہیں۔ یہی اصول ملتِ اسلامیہ پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ اس کی ہستی بھی آئین ہی سے قائم ہے۔ یہی دینِ خداوندی کا راز ہے۔ اس اُمت کا آئین و دستور قرآن کریم ہے۔ یہ اللہ کی وہی رسی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۳/۱۰۲ تم سب اکٹھے ہو کر مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔ اور فرقے پیدا نہ کرو۔ الگ الگ نہ ہو جاؤ۔

اگر ہم نے اس عظیم ہدایتِ قرآنی کی روشنی میں قدم اٹھائے ہوتے تو ہمارے درمیان وہ مستحکم اتحاد قائم ہوتا جو ہمیں، اپنے تمام معاشرتی امور تنظیم و تزئین کے ساتھ سرانجام دینے کا اہل بناتا جس سے ترقی و سرفرازی کی منازل طے کرنے کے راستے کی تمام رکاوٹیں دور ہو جاتیں!!

تنظیم اور نظم و ضبط برقرار رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ زندگی کا نصب العین ہمیشہ اپنے سامنے رکھا جائے۔ ہمیں اپنا نصب العین تلاش نہیں کرنا۔ ہم مسلمانوں کا نصب العین حیات خود خدائے والا صفات

نے مقرر کر دیا ہے اور وہ ہے اس کی کتاب، قرآن حکیم کے قوانین کے مطابق مملکت قائم کرنا اور اجتماعی حیثیت میں ایک امت بن کر اقدارِ قرآنی کے تحت زندگی بسر کرنا۔ اسی طرزِ عمل اور اسی شعارِ زندگی سے معاشرے کو وہ نظم و ضبط حاصل ہوتا ہے جس کا دینِ اسلام ہم سے متقاضی ہے۔ وطن عزیز پاکستان ہم نے اسی مقصد کے لیے حاصل کیا تھا لیکن جب خدا کی رحمت سے ہم اس نعمت کے امین بنا دیئے گئے تو ہم امانت کا مفہوم کھو بیٹھے ہم اپنے وعدے بھول گئے۔ ہم اپنے نصب العین کو پسِ پشت ڈال کر من مانی خواہشات کے مطابق انفرادی زندگی گزارنے کے دامِ فریب میں پھنس گئے۔ ہمارے درمیان سے نظم و ضبط کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ ہم منظم ہو کر اور منظم رہ کر اجتماعی زندگی میں داخل نہ ہوئے۔ پھر ہم غیر متوازن ناہموار اور بے ضابطہ معاشرت سے کیسے دامن بچا سکتے تھے؟ اپنی عبادات نماز، روزہ، حج پر نظر ڈالیے۔ یہ وہ مستقل ارکانِ اسلام ہیں جن کی ادائیگی ہم پر لازم ہے۔ کیا یہ ہمیں جاری و ساری رہنے والے نظم و ضبط کا درس نہیں دیتے اور ہمیں عملی طور پر اس کا پابند نہیں بناتے۔ جبکہ نماز تو وہ رکنِ عظیم ہے جو دن رات میں پانچ مرتبہ ادا ہوتا ہے۔ اس کی ادائیگی سے بڑھ کر ہمیں معاشرتی نظم و ضبط کی راہ اور کہاں سے مل سکتی ہے۔ نماز باجماعت کی یہی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ پھر سال میں پورے ماہ رمضان کے روزے جس طرح دنیا کے تمام مسلمانوں کو نظم و ضبط کا پیغام دیتے ہیں اور اسے اختیار کرنے کا موثر ذریعہ بنتے ہیں، اس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی۔ اسی طرح حج کا اجتماع نظم و ضبط کے جلو میں وہ مقصود و خصوصی رکھتا ہے جو پوری نوعِ انسان کو امتِ واحدہ بننے کا قرآنی راستہ دکھاتا ہے۔ لیکن نماز کی ادائیگی، روزے کی پابندی اور حج کی سعادت حاصل کرنے کی خوش قسمتی کے باوصف جب ہم نظم و ضبط کو اپنا شعار نہیں بناتے تو کیا ہمارا شمار جماعتِ مومنین میں ہو سکتا ہے؟ کیا اللہ کے قانون کے مطابق ہم ایسے ہی لوگوں کی آنکھوں، کانوں اور دلوں پر مہر نہیں لگ جاتی۔ قرآن نے تو یہ اعلان کر دیا ہے کہ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ (۱۶/۱۰۸) یعنی یہ وہ لوگ ہیں۔ جن پر جذبات اس طرح غالب آجاتے ہیں کہ ان میں سننے دیکھنے اور سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی اور یوں وہ اپنے نفع نقصان سے غافل رہتے ہیں۔ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۔ جب اپنے دلوں پر خود ہی تالے لگا لیے جائیں تو انہیں دوسرا کون کھول سکتا ہے؟ کیا یہ بات ہمارے غور کرنے کی نہیں کہ اپنی معاشرتی زندگی کو بہتر اور برتر بنانے کے لئے ہمیں نظم و ضبط کو اختیار کرنے کی جس قدر زیادہ ضرورت ہے اُس سے کہیں بڑھ کر ہم اس سے دُور ہو چکے ہیں۔ بڑی باتوں اور اہم معاملات تو بدنظمی کا شکار ہیں ہی۔ یہاں تو روزمرّہ کے چھوٹے چھوٹے امور میں بھی نظم و ضبط سے کام نہیں لیا جاتا۔ مثال کے طور پر قطار بندی کو ہی لیجیئے۔ بظاہر یہ ایک معمولی سی بات ہے۔ کوئی مشکل امر نہیں۔ بس ایک نظم کے ساتھ خود پر ضبط رکھنے اور قابو پانے کی بات ہے۔ جس کے لیے ہم لوگ کبھی خوش دلی سے تیار نہیں ہوتے۔

فراخیٔ ذہن سے قبول نہیں کرتے۔ خود بھی الجھتے ہیں دوسروں کو بھی الجھاتے ہیں۔ حالانکہ اگر اس کو ضرورت کے موقع پر اپنا معمول بنا لیا جائے۔ تو اس ایک اقدام سے ہماری بیشتر کج رویاں ختم ہو سکتی ہیں۔ قطار بندی کا مثبت رویہ خود غرضی کے منفی جذبے کو پنپنے نہیں دیتا۔ اس سے دوسروں کے حقوق کی پہچان ہوتی ہے۔ اپنی اپنی جگہ پر رہتے ہوئے مساوات کی لڑی میں پروئے ہوئے۔ اس تنظیم سے ہی زندگی کے ہر موڑ پر راست قدمی کا شعور افرادِ معاشرہ کی رہبری کرتا ہے۔ نظم وضبط کا سلیقہ اپنے نفس اور مفاد پرستی پر قابو پانے کی تربیت دیتا ہے۔ دوسروں کو متوازن رکھنے میں معاون بنتا ہے۔ معاشرے میں نظم و ضبط کی مستحکم فضا پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی ابتداء گھروں سے کی جائے۔ اس سلسلہ میں یہ اہم ذمہ داری والدین کی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تربیت اس نہج پر کریں۔ کہ ان کے بچے جب سنِ شعور کو پہنچ کر شہری کی حیثیت سے معاشرے میں داخل ہوں تو ان کا ذہن متوازن اور ہموار سوچ کا حامل ہو۔ تاکہ وہ حسن و توازن کے ساتھ معاشرتی امور کی انجام دہی میں حصّہ لے سکیں۔ کردار کا حسن و توازن ہی نوجوانانِ قوم کو نظم و ضبط کا پابند رکھتا ہے۔ اور اس طرزِ عمل سے پوری قوم فیض یاب ہوتی رہتی ہے۔ تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھئے۔ کارزارِ حیات میں ہمیشہ وہی قومیں کامیاب و سرفراز رہیں جنہوں نے اتحاد و تنظیم کی اہمیت کو سمجھ کر لازمۂ حیات بنائے رکھا اور جن کا قومی کردار نظم و ضبط کی بنیاد پر استوار رہا۔ برعکس اس کے جن اقوام یا افراد نے بدنظمی اور بے ضابطگی کو اپنائے رکھا نہ وہ کبھی ماضی میں ذلت و خواری سے بچ سکے، نہ وہ حال میں معزز و محترم ہو سکتے ہیں۔ ایسے ماضی و حال کے بعد مستقبل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ربّ العالمین کے عطا کردہ ابدی طور پر متعین اصولوں کو چھوڑ کر اپنے اپنے خیالات کے مطابق اپنی ذات کیلئے جینا حیوانی سطح کی زندگی ہے۔ اس طرزِ عمل سے انسانی زندگی کا کوئی پہلو بھی برومند نہیں ہو پاتا۔ اور بدنظمی سے تو ساری معاشرتی زندگی انتشار و خلفشار میں گھری رہتی ہے۔ ہماری موجودہ معاشرت اسکی واضح مثال ہے۔ تاہم معاشرتی ناہمواریوں کو دور کرنا بہرحال ہماری ہی ذمہ داری ہے۔ اس سلسلے میں نظم و ضبط کا اصول اپنانے بلکہ اسے جزوِ زندگی بنانے کی بالخصوص ضرورت ہے کہ یہ وہ عظیم اصول ہے جو نہ صرف معاشرتی برائیوں اور خرابیوں کا قلع قمع کرتا ہے بلکہ اس ایک اصول کا پابند رہنے سے دیگر اصول و اقدارِ حیات خود بخود انسانی زندگی کا اٹوٹ حصہ بنتے چلے جاتے ہیں۔ یہی مسلمان کی زندگی ہے۔ یہی منشائے ایزدی ہے۔ اس لیے آیئے ہم آہنگی کے ساتھ اُس طرف متوجہ ہوں۔ اپنے شب و روز کے گزرتے لمحات میں اپنی زبان سے کہی جانے والی بھلائیوں، اپنے قلم سے لکھی جانے والی خوبیوں کو اپنے اعمال میں منتقل کریں۔ یاد رکھیئے ہماری جو اچھی بات، جو اعلیٰ تحریر، عمل کی شکل اختیار نہیں کرتی، وہ پرِکاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔ ہمارے لیے یہ لمحۂ فکریہ ہے۔ ہمارا "موٹو" (MOTTO) یہ ہونا چاہیئے کہ "بے عملی اور بدعملی کسی انسان کے شایانِ شان نہیں۔"

حسن عباس رضوی

فتویٰ بنام فتویٰ

شعبان کا چاند

ابھی شب برات سے متعلق رویتِ ہلال کا قضیہ ماند نہیں پڑا تھا کہ رمضان المبارک کے رویتِ ہلال کا تنازعہ عود کر آیا۔ بات یوں ہوئی کہ ۳۰ مارچ ۱۹۸۷ء کو مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی کے چیرمین جسٹس پیر کرم شاہ الازہری نے اعلان کیا کہ یکم شعبان یکم اپریل بروز بدھ ہوگی اور شبِ برات ۱۴ اور ۱۵ کی درمیانی شب کو ہوگی۔ لیکن اس کے بارہ دن بعد اعلان کیا گیا کہ شعبان کی پہلی تاریخ ۳۱ مارچ بروز منگل تھی۔ لہٰذا شب برات ۱۳ اور ۱۴ شعبان کی درمیانی رات کو ہوگی۔ اس دوہرے اعلان پر (CON TROVERSY) شروع ہوگئی۔ دوسرے اعلان کی تفصیل اخباری رپورٹ کے مطابق اس طرح تھی۔

"مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی کے چیئرمین جسٹس پیر کرم شاہ الازہری نے اعلان کیا ہے کہ شبِ برات ۱۳ اور ۱۴ اپریل کی درمیانی شب یعنی آج (۱۳ اپریل) ہوگی۔ مرکزی رویت ہلال کمیٹی نے اس سے پہلے پشاور میں اپنے اجلاس میں ۳۰ مارچ کو اعلان کیا تھا، کہ یکم شعبان یکم اپریل بروز بدھ کو ہے۔ یہ فیصلہ پشاور میں مطلع ابر آلود ہونے اور ملک کے کسی حصے میں شعبان کا چاند نظر آنے کی اطلاع نہ ملنے کے بعد کیا گیا تھا۔ اب متعدد مقامات سے اطلاع موصول ہونے کے بعد اس بات کی تصدیق ہوگئی ہے کہ شعبان کی پہلی تاریخ ۳۱ مارچ بروز منگل تھی اور شبِ برأت ۱۳ اور ۱۴ کی درمیانی رات ہوگی۔ مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی کے چیئرمین نے کہا ہے کہ یہ فیصلہ شرعی شواہد اور دلائل کی روشنی میں کیا گیا۔ اے۔ پی۔ پی کے مطابق پیر کرم شاہ نے بھیرہ (سرگودھا) سے ٹیلیفون پر پریس ریلز لکھاتے ہوئے کہا کہ واہ کینٹ اور مری سے دو دو افراد نے مرکزی جامعہ مسجد راولپنڈی کے امام مولانا صاحبزادہ فیض علی فیضی کے روبرو تصدیق کی ہے کہ انہوں نے ۳۰ مارچ کو چاند دیکھا تھا۔ مظفر آباد کے ڈپٹی کمشنر کے مطابق ایک گاؤں ناراں کے .... تقریباً پانچ سو افراد نے ۳۰ مارچ کو چاند دیکھا"

(روزنامہ جنگ مورخہ ۱۳۔ اپریل ۱۹۸۷ء صفحہ ۱ و ۵)

گویا مرکزی روئیت ہلال کمیٹی نے ۱۲ دن بعد پہلا فیصلہ بدل دیا۔ دوسری اخباری رپورٹ ہے کہ

معروف عالم دین مولانا محسن نقوی نے کہا ہے کہ پندرھویں شعبان کے لیے رویتِ ہلال کمیٹی نے نئے اعلان سے قبل جو اعلان کیا تھا وہ معتبر ہے۔ اپنے ایک بیان میں انہوں نے کہا کہ ۱۵ ویں شعبان بروز بدھ ۱۵ اپریل کو ہوگی۔ (ایضاً)

ایک اور اخباری رپورٹ میں ہے کہ

"ممتاز عالم دین اور جامع مسجد جیکب لائنز کے خطیب مولانا تنویر الحق تھانوی نے کہا ہے کہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین نے چاند کے متعلق جو فیصلہ کیا ہے شرعی طور پر اس میں کوئی نقص نہیں ہے۔ انہوں نے مسلمانوں سے کہا ہے کہ اس فیصلے کے مطابق ۱۳، اور ۱۴ اپریل کی درمیانی شب ہی شب برات ہے۔ انہوں نے کہا کہ بعض اوقات چاند کے بارے میں اس قسم کی غلط فہمی ہو جاتی ہے مگر اب کمیٹی نے جو فیصلہ کیا ہے اس کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔" (ایضاً)

اس سلسلے میں صرف ہم اتنا ہی کہتے ہیں کہ وہ کونسی وجوہات تھیں جن کی وجہ سے شعبان کا چاند دیکھنے والے پانچ سو اشخاص کی شہادت قابل تسلیم نہ سمجھی گئی۔ صرف ۱۲ دن بعد۔ اس کے بعد چیئرمین رویت ہلال کمیٹی جسٹس پیر کرم شاہ الازہری نے اس منصب سے استعفیٰ دے دیا ؏

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

اس سلسلہ میں یہ بھی صحیح کہا گیا اس تبدیلی میں شرعی طور پر کوئی نقص نہیں کیونکہ خود ساختہ شرعی اقدار تو ہر آن بدلتی رہتی ہیں لیکن قرآنی اقدار میں نہ تغیر ہے اور نہ تبدل۔ قرآنِ حکیم کی رو سے چاند کی جو منزلیں مقرر ہیں وہ مستقل ہیں اُن میں کبھی کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی $\frac{۳۶}{۲۹-۳۷}$ گویا خدا کی تخلیق کیے ہوئے چاند کی منزلوں میں تو کوئی تبدیلی نہیں البتہ انسان کے وضع کیے ہوئے چاند کی یہی حالت ہے جو آپ مذہب کے اُفق پر دیکھ رہے ہیں کہ "چین چڑھے، چڑھے۔ نہ چڑھے تے نہ چڑھے"، گویا وہ اپنی منزلیں بدلنے کا مکلف ہے۔

رمضان کا چاند

اس کے بعد رمضان المبارک کا مہینہ آتا ہے۔ اس کے چاند کے بارے میں بھی مورخہ ۱۹ اپریل کی اخباری رپورٹ ملاحظہ ہو۔

"چاند نظر آگیا، آج پہلا روزہ ہے"

"مرکزی روئیتِ ہلال کمیٹی کے نئے چیئرمین، مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کی طرف سے رمضان المبارک کا چاند نظر آنے کے اعلان کا متن"

"میں غلام مصطفےٰ قاسمی، چیئرمین مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی، اعلان کرتا ہوں کہ آج بروز منگل، ۲۹ شعبان المعظم ۱۴۰۷ھ، بمطابق ۲۸ اپریل ۱۹۸۷ء کو مرکزی رویت ہلال کمیٹی کا اجلاس، رمضان المبارک کا چاند دیکھنے کے لیے حبیب بینک پلازہ، کراچی میں منعقد ہوا۔ جس میں مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے ..... نے شرکت کی۔ پشاور زونل کمیٹی کے سامنے شہادت شرعی پیش ہوئی اور زونل کمیٹی نے اس شہادت کی اطلاع پر فتویٰ دیا کہ آج بروز منگل رمضان المبارک کا چاند نظر آیا لہٰذا مرکزی رویت ہلال کمیٹی کی اکثریت کی بنیاد پر پشاور زونل کمیٹی کے فتویٰ کی توثیق کرتے ہوئے اعلان کرتی ہے کہ یکم رمضان بدھ مورخہ ۲۹ اپریل کو ہوگا"

(روزنامہ جنگ، مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۸۷ء، صفحہ اوّل وچہارم)

دوسری طرف

"تحریک فقہ جعفریہ نے اعلان کیا ہے کہ بدھ ۲۹ اپریل کو روزہ نہیں ہے۔ تحریک کے سنیئر نائب صدر علامہ سید ساجد علی نقوی نے رات گئے کہا کہ شرعی قوائد و ضوابط کی روشنی میں ہم پورے اعتماد اور وثوق سے اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ ماہِ رمضان کا چاند قطعاً ثابت نہیں ہوا، اس لیے ۲۹ اپریل کو یکم رمضان المبارک نہیں"

اور

کراچی سے ایک اطلاع کے مطابق مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی کے تین شیعہ اور اہل حدیث کے ارکان نے رمضان المبارک کے چاند کے سلسلہ میں کمیٹی کے فیصلے سے اختلاف کیا ہے۔ مولانا شبیہ الحسن مجددی، مولانا محمد نجفی، مولانا احمد عباس نجفی، مولانا شاہ حبیب الرحمٰن بخاری اور مولانا عبدالرحمٰن سلفی نے کہا ہے کہ ان کے نزدیک پشاور سے ملنے والی فردِ واحد کی شہادت شرعاً درست نہیں۔ اس لیے ہم بدھ ۲۹ اپریل روزے کو صحیح نہیں سمجھتے۔ مولانا سلفی نے بتایا کہ اہل حدیث مسلک میں شک کا روزہ جائز نہیں۔ مولانا نجفی نے بتایا ہے کہ فقہ جعفریہ کے نزدیک شک کا روزہ حرام ہے اس لیے بدھ ۲۹ اپریل کا روزہ ناجائز ہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ پشاور کی زونل کمیٹی میں بھی اس معاملہ پر اختلاف ہے اور محض فتویٰ کی بنیاد پر رویتِ ہلال کا اعلان کیا گیا ہے جس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ مولانا نجفی نے مزید بتایا کہ پشاور میں ایک شخص اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ زونل کمیٹی کے سامنے پیش ہوا جس نے کہا کہ اُس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ دیکھو چاند نظر آگیا لیکن ان دو ساتھیوں کو چاند نظر نہیں آیا۔ کمیٹی کے تین ارکان اس

صورت حال میں رویت کے حق میں تھے اور دو مخالف۔ چنانچہ فتویٰ کی بنیاد پر فیصلہ کیا گیا جس کی مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی نے اکثریت رائے سے توثیق کی"

(روزنامہ جنگ، مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۸۷ء صفحہ اوّل و آخر)

اس سلسلہ میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ دونوں طرف یعنی (FOR AND AGAINST) مفتی صاحبان ہیں۔ دونوں نے الگ الگ فتویٰ دیا ہے۔ کس کے فتویٰ کو صحیح تسلیم کیا جائے۔

یہ تو تھا بیان چاند نظر آنے کے سلسلہ میں شخصی شہادت کا جس پر رویت ہلال کمیٹی کا انحصار ہے۔ اس کمیٹی کے پاس کوئی سائنسی علم نہیں جس سے یہ خود چاند کا ہونا یا نہ ہونا معلوم کر سکیں۔ یہ کوئی کمال کی بات نہیں کہ یہ لوگ اُس شہادت کی اطلاع کی بنا پر صرف اعلان ہی کریں جو اُنہیں کسی مقام سے مہیا کی جائے۔ فیصلہ تو اصل میں اُسے کہتے ہیں جو پورے حقائق و مشاہدات اور اُس قانون کو سامنے رکھ کر کیا جائے جو معاملہ سے متعلق ہوں۔

قانونِ الٰہی

خالق کائنات نے تخلیق اشیاء کے ساتھ ہی اُن کے آگے بڑھنے کے لیے ایک محکم اور اٹل قانون مقرر کر دیا وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ۲۲/۲ جس میں کبھی کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ نظامِ شمسی کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۳۶/۳۸

اس پر غور کرو کہ سورج کس طرح اپنے مستقر کی طرف رواں دواں چلا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ اُس خُدا کے ٹھہرائے ہوئے اندازوں کے مطابق ہو رہا ہے

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ (۳۶/۳۹)

اور چاند کو دیکھو اُس کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں (وہ ایک حسین ناخن کی طرح نمودار ہوتا ہے۔ بڑھتا بڑھتا مہِ کامل بن جاتا ہے اور پھر گھٹنا شروع ہو جاتا ہے اور گھٹتے گھٹتے) اس طرح ہو جاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی سوکھی ہوئی ٹہنی۔

لَا الشَّمْسُ يَنبَغِي لَهَا أَن تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۚ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۳۶/۴۰

یہ تمام عظیم الجثہ کُرّے اپنی اپنی جگہ ساکت نہیں کھڑے بلکہ پیہم اور مسلسل حرکت کر رہے ہیں۔ لیکن ان کی یہ حرکت اس طرح حساب اور قاعدے کے مطابق ہوتی ہے کہ کبھی بھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ سورج اپنی رفتار کو تیز کر کے چاند کو جا پکڑے یا کبھی ایسا ہو کہ جس نقطہ سے رات

کا اختتام اور دن کا آغاز ہوتا ہو، رات وہاں سے آگے بڑھ جائے۔ یعنی کسی مقام پر سورج اپنے معینہ وقت کے بعد طلوع ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ ان میں سے ہر کرّہ اپنے اپنے دائرے میں اپنی اپنی رفتار سے ٹھیک اپنے راستے پر تیرتا چلا جاتا ہے (۲۱/۳۳)

محولہ بالا آیات کی رو سے نظامِ شمسی کا دائرہ عمل مقرر کر دیا گیا ہے اور ساتھ ہی چاند کی منزلیں بھی مقرر کر دی گئی ہیں جن کے لیے وہ مُکلّف (ARRESTED) ہے اور کبھی ان میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ چاند کے اس سارے عمل پر نگاہ رکھے۔ کیونکہ سورج کی طرح چاند بھی ایک حسابِ مقرر سے چل رہا ہے۔ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۵۵/۵ اس سارے عمل پر نظر رکھنے کے لیے اور ان سے استفادہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۱۴/۳۳ یعنی انہیں انسان کے تابعِ تسخیر کر دیا ہے۔ یعنی انسان کے فائدے کے لیے قانون کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ اور دونوں مسلسل اپنی رفتار کے مطابق چلتے رہتے ہیں، وہ اپنے فریضہ کی سرانجام دہی میں مسلسل مصروف ہیں۔ جب کیفیت یہ ہے تو کیا چاند اور سورج انسان کی دسترس سے ماوراء ہیں کہ ہمیں چاند کے ہونے یا نہ ہونے کا علم نہ ہو؟ یہ بھی طرفہ تماشا ہے کہ یہاں چاند نظر نہیں آتا وہاں غیروں نے چاند پر کاٹھی ڈال رکھی ہے۔

سائنسی اور فلکیاتی رصدگاہیں

اگر آپ مُلّا کے چنگل سے آزاد ہو کر دیکھیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ چاند معلوم کرنے کے لیے حساب کی ضرورت ہے۔ جس کے لیے جدید سائنسی اور فلکیاتی رصدگاہیں (OBSERVATORIES) موجود ہیں، جن کے لیے قرآن حکیم نے بنیادیں مہیا کر دی ہیں۔ چنانچہ روزنامہ جنگ مورخہ ۲۷ اپریل کے آخری صفحہ پر اوقاتِ سحر و افطار ۱۴۰۷ ہجری کا چارٹ دیا ہوا ہے۔ جس میں پہلا روزہ مورخہ ۳۰ اپریل بروز جمعرات دکھایا گیا ہے۔ اور اس کے نیچے یہ نوٹ دیا گیا ہے۔

"کراچی یونیورسٹی کی رصدگاہ نے اعلان کیا ہے کہ پہلا روزہ ۳۰ اپریل کو ہوگا"

پھر شوال کا چاند دیکھنے کے لیے مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی نے اعلان کیا کہ رویتِ ہلال کمیٹی کا اجلاس ۲۷ مئی (۲۹ رمضان المبارک) کو حبیب پلازہ کراچی میں ہوگا۔ اور اسی اعلان کے نیچے محکمہ موسمیات کی رپورٹ دی گئی ہے کہ

"محکمہ موسمیات کے مطابق ہیتِ فلکی کے اعتبار سے بدھ ۲۷ مئی ۱۹۸۷ء کو غروبِ آفتاب پر کوئی چاند نہیں ہوگا۔ شوال کے چاند کا طلوع ۲۹ رمضان المبارک کو پاکستان کے معیاری وقت

کے مطابق ۸ بجکر ۱۳ منٹ پر ہوگا، لیکن یہ افق سے نیچے ہوگا اس لیے اس شام کو چاند دکھائی دینے کا کوئی امکان نہیں"

(روزنامہ جنگ مورخہ ۲۰ مئی ۱۹۸۷ء صفحہ اول کالم ۴)

چنانچہ مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی کے اندازے کے مطابق چاند ۲۷ مئی کو نظر نہ آیا۔

رہا سوال مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی کے اس اعلان کا کہ رمضان کا چاند ۲۸ اپریل کو نظر آگیا تھا۔ تو اس سلسلہ میں برطانوی رصدگاہ (OBSERVATORY) رائل گرینوچ کے ماہرین کی رائے کے مطابق، ۲۸ اپریل کو چاند دنیا کے کسی بھی حصہ میں نظر نہیں آیا۔ روزنامہ جنگ کی رپورٹ کے مطابق۔

"برطانیہ کی رصدگاہ رائل گرینوچ آبزرویٹری کے مطابق افریقہ، یورپ، ایشیا اور آسٹریلیا کے کسی حصہ میں ۲۸ اپریل ۱۹۸۷ء کو رمضان کا چاند نظر آنے کا امکان نہیں تھا اور نہ ہی ۲۷ مئی ۱۹۸۷ء کی شام عید کا چاند دکھائی دے سکتا ہے۔ اس رائے کا اظہار پاکستانی سکالر مقیم لندن ضیاالدین لاہوری کے نام ایک مکتوب میں کیا گیا ہے۔ اس رائے کے مطابق ذوالحجہ کے چاند کے سلسلہ میں بھی ۲۵ جولائی ۱۹۸۷ء کو رویتِ ہلال کے امکان کی نفی کی گئی ہے۔"

(روزنامہ جنگ مورخہ ۲۶ مئی ۱۹۸۷ء صفحہ اول کالم ۲)

تصریحاتِ بالا سے ظاہر ہے کہ ماہرینِ فلکیات و موسمیات (یعنی ہیئتِ فلکی) کی رو سے رویتِ ہلال کمیٹیوں کے تمام فیصلے غلط تھے کیونکہ یہ قرآن کی عطا کردہ بنیادوں اور پیمانوں کے خلاف تھے۔ آپ دیکھیں گے کہ جب قرآنی اقدار کو ترک کیا گیا اور انسانی جذبات کو راہنما بنایا گیا تو انسان بحرِ ظلمات میں کس کس قسم کی ڈبکیاں کھاتا نظر آتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ عرض کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ قرآنِ حکیم میں چاند دیکھ کر روزہ رکھنے کا کہیں ذکر نہیں ارشادِ الٰہی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۲/۱۸۳

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! تم پر اس طرح روزہ فرض کر دیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلی قوموں پر روزہ فرض کیا گیا تھا، تاکہ تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کر سکو۔ جس سے تمہارا کیریکٹر بلند ہوگا۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ ..... فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ

فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۲/۱۸۵

رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔ لہٰذا تم میں سے جو اس مہینہ میں گھر پر موجود ہو تو وہ اس مہینہ کے روزے رکھے۔ البتہ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔

محولہ بالا آیات میں صرف یہی ہے کہ جو اس مہینہ میں گھر پر ہو وہ اس مہینہ کے روزے رکھے جو پورے مہینے کے ہیں۔ جب چاند کا ہونا چاند نظر آنے میں تبدیل ہو گیا تو پھر رویتِ ہلال کے جھگڑے پیدا ہو گئے۔ نتیجۃً معاملہ سائنسدان کے ہاتھ سے نکل کر مُلّا کے ہاتھ آگیا جس کا یہ میدان ہی نہیں۔ یہ پودا تھیوکریسی (THEOCRACY) کا لگایا ہوا ہے جو قرآن حکیم کی رُو سے شجرِ ممنوعہ ہے۔

بانیٔ پاکستان کے تاثرات

اس پر اس وقت تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں جو ایک علیحدہ موضوع ہے۔ لیکن بانیٔ پاکستان جناب قائداعظم محمد علی جناحؒ نے PRIESTHOOD کے بارے میں واشگاف الفاظ میں فرمایا تھا:۔

پاکستان کی جدوجہد کو مذہب سے تعبیر کیجیے تو ہمارے عُلماء کی ایک جماعت بغیر اس بات کے سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت، تقسیم عمل اور اُس کے اصل حدود کیا ہیں، اِن امور کو صرف چند مولویوں کا اجارہ خیال کر لیتی ہے اور (اپنے حلقہ سے باہر) اہلیت و مستعدی کے باوجود مجھ میں یا آپ میں (یعنی کسی اور میں) اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی۔ حالانکہ اس منصب کی بجاآوری کے لیے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے انہیں میں اِن مولوی صاحبان میں (الّا ماشاء اللہ) نہیں پاتا۔ (اور پھر مشکل اندر مشکل یہ کہ) وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔"

(قائداعظم ۱۹۴۱ء بحوالہ طلوع اسلام ۱۳ اگست ۱۹۵۵ء)

مولوی صاحبان کا مبلغِ علم

یہ ہے حقیقت اُن فضلاء کی جنہیں ہم نے سیاہ و سفید کا مالک بنا رکھا ہے۔ ان حضرات کے مبلغِ علم کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں لاؤڈ سپیکر کا استعمال شروع ہوا تو علمائے کرام سے اس کے جائز ناجائز ہونے کے متعلق فتویٰ مانگا گیا۔ اس فتویٰ کے جواب میں جمعیت العُلما کے صدر مفتی کفائت اللہ (مرحوم) نے لکھا تھا کہ

"جس آلہ کے متعلق سوال کیا گیا ہے وہ اب تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ مگر سننے میں آیا ہے۔ کہ وہ ایک ایسا آلہ ہے جسے خطیب یا قاری کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ اور وہ اس کی طرف

رُخ کیے ہوئے قرآت یا خطاب کرتا ہے۔ پس وہ آلہ آواز کو جذب کر کے اتنی دور نشر کرتا ہے
کہ اس کے چوتھائی فاصلہ تک بھی بغیر اس کی مدد کے آواز پہنچانا مشکل ہے۔ (بحوالہ النقیب ۱۱/۴ ۱۰)

اس کے بعد مفتی صاحب نے اس کے جواز کا فتویٰ دے دیا تھا۔ لیکن دارالعلوم (دیوبند) کے ایک بہت بڑے مُفتی (محمد شفیع) صاحب (مرحوم) جو پاکستان بننے کے بعد کراچی آ گئے تھے، نے الیگزنڈر ہائی سکول بھوپال کے سائنس ماسٹر، برج نندن لال صاحب سے اس کی کیفیت و ماہیت دریافت کی جس کی بنیاد پر مفتی صاحب نے خُدا اور رسول کے حوالہ سے لاؤڈ سپیکر کے استعمال کو حرام قرار دے دیا۔ لیکن بعد میں یہی حرام حلال قرار پا گیا اور تمام مفتیان اور علمائے کرام، معہ مفتی محمد شفیع صاحب (مرحوم) لاؤڈ سپیکر کو نماز اور خطبات میں بلا تکلف استعمال کرتے رہے۔

رویت ہلال کے سلسلہ میں ہم مدت سے کہتے چلے آ رہے ہیں۔ کہ یہ مولوی صاحبان کا میدان نہیں۔ اس کا تعلق ماہرینِ موسمیات اور ماہرینِ فلکیات و ریاضی سے ہے۔ جو ہیئتِ فلکی کے علم سے بہرہ ور ہیں۔ اور یہ بتا سکتے ہیں کہ چاند ہوا ہے یا نہیں۔ چنانچہ حال ہی میں، روزنامہ جنگ مورخہ ۴ جون ۱۹۸۷ء صفحہ ۲، کالم، کالم، ۳، ۴، صفحہ ۷، کالم ۱، کے مطابق، جنگ کے فورم ہال میں رویتِ ہلال کے مسئلہ پر منعقدہ مذاکرہ کے شرکاء نے، رویتِ ہلال کمیٹی کے متضاد فیصلوں پر تشویش کا اظہار کیا اور یہ محسوس کیا کہ رویتِ ہلال کمیٹی نے سائنسدانوں اور ماہرینِ فلکیات وارضی کو مناسب نمائندگی ملنی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں وزیرِاعظم کے مشیر برائے مذہبی امور نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اگر گرد آلود فضا میں چاند دیکھنے کا کوئی سائنسی آلہ موجود ہے تو وہ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ تاکہ اُسے لاہور اور کراچی میں نصب کیا جائے انہوں نے اس حقیقت کا بھی اعتراف کیا کہ فلکیاتی اعتبار سے چاند کا وجود اور بصری رویت یعنی آنکھ سے چاند دیکھنا دو الگ معاملات ہیں جن کا ادراک ماہرین کے لیے بہت ضروری ہے۔

پھر ایسی کمیٹیوں اور اداروں میں مولوی صاحبان کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ جو اُن کا میدان نہیں۔ اس پر یہی کہا جا سکتا ہے۔

ہے زمانہ خود زمانے کا علاج

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ ۸۴/۶

ہزار جانکاہ مشقتوں کے بعد ہی سہی لیکن اِنسان کو بالآخر اُسی (قانونِ خداوندی) کی طرف آنا ہے۔

حقائق و عبر

۱۔ تیری آواز مکے اور مدینے!

ایک قدامت پسند مذہبی رسالے میں، اسلامی حکومت کی جو ذمہ داریاں گنوائی گئی ہیں ان میں سے ۷ اور ۸ یہ ہیں۔

"۷۔ اسلامی مملکت کی حکومت جو "بما انزل اللہ" ۵/۴۸ کو نافذ العمل کرنے کی ایجنسی اور مشینری ہوتی ہے۔ وہ مملکتِ خداداد میں جہاں تمام افرادِ مملکت سے اللہ تعالیٰ کے نام پر اطاعت کا اقرار لیتی ہے وہاں ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا عہد بھی کرتی ہے۔ جس کا خالق کائنات نے اپنے بندوں سے وحی خداوندی کے ازلی و ابدی پیغام (قرآن کریم) میں وعدہ کر رکھا ہے۔ لہٰذا اسلامی حکومت کی ان عظیم اور مقدس ذمہ داریوں کو بحسن خوبی پورا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مملکت کے تمام ذرائع ... ۔ پیداوار یعنی رزق کے سرچشمے جو کہ ملک اللہ ہوتے ہیں۔ اسلامی حکومت کی تحویل میں ہوں تاکہ وہ ان وسائل کو پوری طرح استعمال میں لاکر اپنے فرائض کو احسن طریقہ سے ادا کر سکے۔

۸۔ چنانچہ اسلامی حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ متعلقہ ذرائع پیداوار کو مناسب اور احسن طریقہ سے منظم کر کے افرادِ معاشرہ کی تحویل میں دے۔ جو اپنی تمام ذہنی، جسمانی و مادی وسیلوں اور صلاحیتوں کو استعمال میں لاکر تمام افرادِ معاشرہ کے لئے زیادہ سے زیادہ ضروریاتِ زندگی پیدا کرنے کی مقدور بھر کوشش کریں۔ تاکہ ضرورت مندوں کی جائز ضروریات پوری ہو سکیں۔ اور کسی فردِ معاشرہ کی کوئی ضرورت رکی نہ رہے۔ اور اس طرح مملکتِ خداداد مندرجہ ذیل اقوال و افعال کا زندہ نمونہ بن سکے۔ جو تاریخ اقوامِ عالم میں روشنی کے مینار کی طرح روشن نظر آرہے ہیں۔ اور یہ کہ ارض اپنے پیدا کرنے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔"

(ماہنامہ شمس العلماء بھیرہ ضلع سرگودھا بابت مئی ۱۹۸۷ صفحہ ۴۵)

اگر اس عبارت کے نیچے ماہنامہ شمس الاسلام بھیرہ جیسے قدامت پسند مذہبی رسالے کا حوالہ نہ

دیا جاتا تو قارئین طلوع اسلام یہ سمجھتے کہ یہ عبارت پرویز صاحب کی کتاب نظام ربوبیت سے لی گئی ہے۔ علماء میں یہ تبدیلی خوش آئند ہے اور آخر کار وہ قرآن مجید کی اسی تعلیم کی طرف آ رہے ہیں۔ جسے علامہ پرویز صاحب ساری عمر پیش کرتے رہے، اور یہ حضرات اس کی مخالفت کرتے رہے۔

ذٰلِكَ فضل الله يؤتيه من يَّشَاءُ

۲۔ جعلی اور جھوٹی احادیث

خود اہل حدیث حضرات کے نزدیک بعض احادیث جعلی اور جھوٹی ہیں۔ ان کے نزدیک ان کی پہچان کیا ہے اس بارے میں جماعت اہل حدیث کے ترجمان ہفت روزہ الاعتصام اپنی یکم مئی ۱۹۸۷ء کی اشاعت میں ایک معیار کی نشاندہی کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا خواب بیان کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا، گویا میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ میرے ہاتھ میں ایک پنکھا ہے جس کے ذریعے میں آپ سے مکھیوں اور دوسرے حشرات الارض ہٹا رہا ہوں (مقدمہ فتح الباری ص۴) اس کی تعبیر یہ نکالی گئی کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو اس امر کی رہنمائی کی گئی ہے کہ وہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے والی جعلی اور جھوٹی روایات کا قلع قمع کریں۔"

(ہفت روزہ الاعتصام یکم مئی ۱۹۸۷ء ص۱)

اس معیار سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ صرف بخاری شریف میں دی گئی تین چار ہزار احادیث صحیح ہیں، کیا حدیث کی بقیہ چھیالیس کتابوں کے جامعین کو بھی ایسے ہی خواب دکھائے گئے۔

۳۔ عائلی قوانین اور جماعت اسلامی

جماعت اسلامی کے ترجمان ہفت روزہ ایشیا نے اپنی ۱۰ مئی ۱۹۸۷ء کی اشاعت میں اس دعوت کی تفصیلات شائع کی ہیں، جو جماعت اسلامی کی جانب سے امام کعبہ الشیخ السبیل کے استقبال میں دی گئی تھی شیخ صاحب نے اس موقع پر جو کچھ فرمایا اسے ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے۔

"سپاسنامہ کے جواب میں امام صاحب نے دوسری باتوں کے علاوہ ضیاء الحق صاحب کے بارے

میں بھی ارشاد فرمایا کہ وہ نفاذِ اسلام کے لئے کوشاں ہیں لہٰذا دینی جماعتوں کو ان سے تعاون کرنا چاہیئے۔ اس پر امیر جماعت نے اپنے خطاب میں امام صاحب سے درخواست کی کہ وہ صدر ضیاؒ کو بھی مجبور کریں کہ وہ واقعی اسلامی نظام نافذ کرے۔

میاں صاحب نے امام کعبہ کو بتایا کہ پاکستان میں مسلم پرسنل لا بھی اسلام کے مطابق نہیں ہے صدر صاحب کم از کم اسے تو اسلام کے مطابق درست کر کے نافذ کریں"۔

(ہفت روزہ الشیار لاہور بابت ۱۰ مئی ۱۹۸۷ء صفحہ ۱۹)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی کے موجودہ امیر نے، اپنے سابقہ امیر سید ابوالاعلیٰ کی کتاب حقوق الزوجین کا مطالعہ کرنے کی تکلیف گوارا نہیں فرمائی۔ طلوع اسلام کے صفحات پر متعدد مرتبہ یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ مودودی صاحب کی یہ کتاب مصری عائلی قوانین کا اردو چربہ ہے جبکہ پاکستان عائلی قوانین ان کا انگریزی ایڈیشن۔ اصل میں دونوں ایک ہیں۔

اس سے ایک اور حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ خود جماعت اسلامی والے اپنے سابق امیر کی کتابوں کا مطالعہ نہیں کرتے ورنہ وہ عائلی قوانین کی کبھی مخالفت نہ کرتے۔

۴۔ مروجہ نظامِ زکوٰۃ

ملک بھر میں مروجہ نظامِ زکوٰۃ کی اصلاح کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ہفت روزہ چٹان لاہور اپنی سولہ مئی ۸۷ء کی اشاعت میں لکھتا ہے۔

"یہ بہرحال ماننا پڑے گا کہ مزدور اور غریب عوام پاکستان میں ایک طاقت ہیں مگر ایک طاقت ان کے علاوہ بھی ہے جس کی طرف نہ حکومت توجہ دیتی ہے نہ ہی سیاستدان! حالانکہ وہ بھی کوئی چھوٹی طاقت نہیں بلکہ ان کی تعداد اور ان کی طاقت بھی بہت بڑی ہے۔ میری مراد پاکستان کے بھکاری ہیں، جو گلیوں، کوچوں، سڑکوں اور محلوں، شہروں، قصبوں، عدالتوں، مسجدوں، بازاروں، بسوں، گاڑیوں اور عام راہوں میں دندناتے پھرتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں تو ہزاروں کی تعداد میں دکانداروں راہگیروں اور مسافروں سے جگا ٹیکس وصول کرتے ہیں، کوئی ان کو پوچھنے، روکنے، ٹوکنے والا اور منع کرنے والا نہیں۔ اب رمضان المبارک آتے ہی ان کے روپوش افراد میں بھی گویا بھونچال سا آگیا ہے، ان کی ساکت و جامد طاقت میں زبردست حرکت آگئی ہے۔ ان کی سرگرمیاں خاصی تیز ہو

گئی ہیں۔ پاکستان میں بھکاری ایک مسئلہ بن چکا ہے۔ ایک پاکستانی سیاح جب ایک ماہ بعد غیر ملکی دورے سے واپس ملک کے کسی بھی ایئرپورٹ پر اترتا ہے تو اپنے خویش و اقارب سے پہلے اس کی بھکاری سے مڈبھیڑ ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں نام نہاد اسلامی حکومت نے زکوٰۃ اور عشر کا نظام رائج کر رکھا ہے۔ اور لوگوں میں زکوٰۃ تقسیم بھی کی جاتی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس نظام کے نفاذ سے ان کی تعداد میں کوئی کمی بیشی نہیں آئی بلکہ اضافہ ہی ہوا ہے۔ پھر معلوم ہوتا ہے وہ زکوٰۃ کن غریبوں میں تقسیم کی جاتی ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے تو یہ زکوٰۃ جو مقامی چیئرمینوں کے ذریعے دی جاتی ہے کسی بھی حقدار کو کماحقہٗ نہیں ملتی۔ زکوٰۃ کا کچھ حصہ دینی مدارس کو دے کر علماء حضرات کی حمایت حاصل کر لی جاتی ہے اور "کتا کنوئیں میں ہی موجود ہے۔"

(ہفت روزہ چٹان، لاہور ۱۶ مئی ۱۹۸۷ء صـ۱۶)

ہم اس تبصرے پر کسی اضافے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

۵۔ شریعت بل کا "پکوڑا"

ہفت روزہ چٹان شریعت بل پر طنزیہ تبصرے شائع کرتا رہتا ہے۔ اس کا ایک حالیہ تبصرہ ملاحظہ ہو۔

" ایک طرف جناب صدر اور عزت مآب وزیراعظم کی کشمکش جاری ہے۔ دوسری طرف شریعت محاذ والے سیاست کے تیل میں "شریعت بل" کا پکوڑا تلنے میں مصروف ہیں۔ جب ہم ان کے نام کے ساتھ "متحدہ" کا سابقہ دیکھتے ہیں تو ہمیں بہت سے سابقے یاد آجاتے ہیں۔ رہ گیا ۲۷ رمضان کا الٹی میٹم تو اب یہ تاریخ دور نہیں، اس کے بعد جو کچھ ہوگا سب کے سامنے آجائیگا۔

مجید لاہوری نے "نمکدان" میں تقسیم برصغیر کے بعد بھارتی اور پاکستانی قیادت کا ایک موازنہ شائع کیا تھا۔ اور خاکساروں کے ہاتھوں انہیں جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ ہم اس کا جدید ایڈیشن چھاپ کر کسی کی دشمنی مول نہیں لینا چاہتے، اور ویسے بھی "ہمارا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے" کاش اپنے تئیں "دین اسلام کے واحد علمبردار" یہ سوچیں کہ ملکی سیاست میں جو روش انہوں نے اپنائی ہے اس کا انجام کیا ہوگا؟

بعض دوستوں نے "شریعت بل" پر ہمارے خیالات کا نوٹس لیا ہے۔ "چٹان" میں کچھ خطوط بھی

شائع ہوئے ہیں ضروری نہیں ہر بات کا جواب دیا جائے۔

(ہفت روزہ چٹان لاہور۔ بابت ۱۶ مئی ۱۹۸۷ صہ ۹)

۶۔ علمار حضرات کے عید کے دن کے مشغلے

عید خوشیاں منانے کا دن ہے اور خوشیاں بھی ایسی کہ خود اللہ تعالیٰ نے ان کے منانے کی تاکید فرمائی ہے ملاحظہ ہو سورۃ یونس آیت ۵۸۔ لیکن ہمارے علمار اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر کس طرح عمل کرتے ہیں اس کی جھلک دیکھنے کے لئے مندرجہ ذیل دو واقعات ملاحظہ ہوں، جن کی تفصیلات قومی اخبارات کی یکم جون ۱۹۸۷ء کی اشاعتوں میں صفحہ اول پر شائع ہوئی ہیں۔

۱۔ چنیوٹ کی مرکزی عید گاہ میں نماز عید کے موقع پر پنجاب اسمبلی کے رکن مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ اور مدرسہ احیار العلوم عربیہ کے مہتمم مولانا محمد حسین چنیوٹیؒ کے کارکنوں میں تصادم ہوگیا جس کی وجہ سے نمازیوں میں بھگدڑ مچ گئی اور ہزاروں افراد نماز عید ادا کئے بغیر گھروں کو واپس چلے گئے۔ اس افراتفری میں متعدد بچے بھی ورثار سے بچھڑ گئے۔ مولانا محمد حسین چنیوٹیؒ اور ڈنڈوں سے مسلح ان کے پندرہ ساتھیوں ارشد امین اور محمد اسلم بٹ وغیرہ کے خلاف زیر دفعات ۱۸۶، ۱۴۸، ۱۴۹ ت پ اور ۱۶ ایم پی او کے تحت مقدمہ درج کر لیا گیا ہے جبکہ ان کے مخالف گروپ کے مولانا محمد افضل وارث حاجی محمد زکریا بھٹیؒ۔ مشتاق احمد راجہ اور شیخ محمد رفیق وغیرہ کے خلاف بھی انہی دفعات کے تحت مقدمہ درج کیا گیا ہے۔ پولیس مولانا محمد حسین چنیوٹیؒ اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاری کے لئے چھاپے مار رہی ہے تاحال کسی گرفتاری کی اطلاع نہیں ملی۔ اسی روز نماز جمعہ کے بعد پنجاب اسمبلی کے رکن مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ کی قیادت میں جامع مسجد محلہ گڑھا سے ایک جلوس نکالا گیا جس کے شرکار حکومت اور قومی اسمبلی کے رکن سردار زادہ محمد علی شاہ کے خلاف نعرے لگا رہے تھے اور مولانا محمد حسین چنیوٹیؒ کی گرفتاری کا مطالبہ کر رہے تھے۔

۲۔ عید الفطر کے روز نواحی گاؤں کوٹ آہدیاں میں امامت کے تنازعہ پر دونوں فریقوں میں تصادم ہوا جس کے نتیجہ میں مسجد کا امام عنایت ہلاک ہوگیا۔ دونوں فریقوں میں تقریباً ایک گھنٹہ تک فائرنگ ہوتی رہی۔ لوگوں نے دوڑ کر اپنی جانیں بچائیں۔ بتایا گیا ہے کہ ملزم مولوی رحمت علی اکثر نماز پڑھایا کرتا تھا۔ لیکن آجکل عنایت اللہ امامت کے فرائض دے رہا تھا۔ رحمت علی نے عنایت اللہ

(باقی صہ ۲۷ پر)

باب المراسلات

صحافتی بددیانتی

سعودی عرب سے قارئین طلوع اسلام میں سے ایک صاحب نے ہمیں ربانی بک ڈپو، دہلی، سے حکیم مصباح الدین صاحب کے شائع کردہ ترجمہ "مشکوٰۃ شریف" کے مقدمہ کی ایک صفحہ کی فوٹو کاپی ارسال کی ہے جسے مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی دہلوی فاضل دیوبند نے تحریر کیا ہے۔ وہ اس مقدمہ میں رقمطراز ہیں۔

"الحمدللہ علماء اسلام نے انکار حدیث کے فتنے کا علم اور تحقیق کی روشنی میں بھرپور مقابلہ کیا اور اس کے اثرات اب سامنے آرہے ہیں۔ پاکستان کے مشہور منکرِ حدیث چودھری پرویز صاحب نے ابھی حال میں اپنے قدیم خیالات سے توبہ کا اعلان کیا۔ چودھری صاحب نے انکارِ حدیث پر اردو میں جسقدر ذخیرہ پھیلایا شاید ہی کسی دوسرے نے پھیلایا ہو۔

موصوف نے چہل حدیث پر نہایت خوشنما اور معیاری کتاب شائع کی اور اس کتاب کی اشاعت کو انکار حدیث سے توبہ کا اعلان قرار دیا۔"

ایک دنیا جانتی ہے کہ محترم غلام احمد پرویزؒ صاحب اور ادارہ طلوع اسلام کے حدیث کے متعلق مؤقف پر ادارہ طلوع اسلام کی صرف ایک کتاب بعنوان "مقام حدیث" ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ اس واحد کتاب کے علاوہ اس موضوع پر محترم پرویزؒ صاحب نے کوئی دوسری کتاب نہیں لکھی۔

مزید برآں محترم پرویزؒ صاحب کی جملہ تصنیفات یا تو ادارہ طلوع اسلام شائع کرتا رہا ہے۔ اور یا اب طلوع اسلام ٹرسٹ کی طرف سے شائع ہو رہی ہیں۔ ان کے علاوہ موصوف کی کوئی کتاب کسی اور ادارہ یا شخص نے کبھی شائع نہیں کی۔

اس حقیقت الامری کے پیش نظر مذکورہ "مقدمہ" کے راقم کا محولا بالا بیان سراسر بددیانتی اور دروغ گوئی ہے۔

محترم پرویزؒ صاحب کا تاریخ و حدیث کے متعلق مسلک ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع شدہ

مقصد و مسلک، میں یوں بتایا گیا ہے۔

(۱) نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ، شرف و عظمتِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے۔ جو تمام نوعِ انسانی کے لیے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے، اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے۔ سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے۔ یا جس سے حضورؐ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضورؐ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی اصول صحابۂ کبارؓ کی سیرتِ مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہیئے۔

(۲) جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو، یا جس سے حضورؐ نبی اکرم یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

یہ وہ مسلک ہے۔ جسے موصوف عمر بھر دہراتے چلے گئے۔ لہٰذا اس کے خلاف جو کچھ بھی ان کی طرف منسوب کیا جائے گا، وہ مخالفین کے گمراہ کن پراپیگنڈہ کے سوا کچھ نہیں۔

لہٰذا مولانا موصوف کی اس دروغ بافی اور علمی بددیانتی پر اس کے سوا کیا کہا جائے کہ:۔

گر ہمی مکتب و ہمی مُلّا ، کار طفلاں تمام خواہد بود۔

بقیہ: حقائق و عبر۔ از صفحہ ۲۵

کو امامت کرنے سے منع کیا۔ نمازیوں کے اصرار پر امامت کرتا رہا۔ وقوعہ کے روز مولوی عنایت اللہ نے عیدالفطر کی نماز قریبی گراؤنڈ میں پڑھائی اور وہاں سے فارغ ہو کر گھر جا رہا تھا کہ راستے میں رحمت علی اپنے ساتھیوں طفیل، اعظم، فیروز دین، عبداللہ وغیرہ کے ہمراہ چھپ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ رحمت علی نے للکارا مارا آج عنایت اللہ بچ نہ جائے اس پر ملزموں نے اندھا دھند فائرنگ کی، جس سے مولوی عنایت اللہ موقع پر ہلاک ہو گیا۔ جب کہ ایک نوجوان اعظم بھی زخمی ہوا۔ نارنگ پولیس نے حملہ آوروں کے خلاف قتل کے الزام میں مقدمہ درج کر لیا ہے تاحال پولیس کسی ملزم کو گرفتار نہیں کر سکی۔ پولیس نے عنایت اللہ کی لاش پوسٹ مارٹم کرانے کے بعد ورثاء کے حوالے کر دی ہے۔"

(روزنامہ امروز لاہور یکم جون ۱۹۸۷ء صـ۱)

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے ... ؟

آئے دن، جماعت اسلامی کے مختلف حلقوں کی طرف سے کسی ضرورت کے تحت اس قسم کا پراپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ بانیٔ پاکستان حضرت قائداعظمؒ اور سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کے آپس میں نہایت گہرے مراسم تھے۔ جماعت اسلامی کے موجودہ امیر، میاں طفیل محمد صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ قائداعظمؒ نے مودودی صاحب کے دیئے ہوئے نظریہ پر پاکستان حاصل کیا تھا۔ ملاحظہ ہو:-

"تین شخصیتوں نے پاکستان بنایا۔ اولاً علامہ اقبالؒ نے، جنہوں نے الگ مملکت کا تصور دیا۔ دوم مولانا مودودی، جنہوں نے نظریہ دیا اور سوم حضرت قائداعظمؒ جنہوں نے پہلے دونوں حضرات کی سوچ کو عملی شکل دی اور نظریہ اور تصور کی بنیاد پر پاکستان حاصل کیا۔"

(روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۱۷ مئی ۱۹۷۶ء)

جس پر طلوعِ اسلام بابت جون ۱۹۷۶ء میں لمعات کے تحت اس جھوٹ کی قلعی کھولی گئی تھی۔ اور طلوعِ اسلام کے جولائی ۱۹۷۶ء کے شمارہ میں مولانا غلام مرشدؒ (سابق خطیب بادشاہی مسجد لاہور ۶۶ - ۱۹۳۵) کا مقالہ بعنوان قائداعظمؒ اور قرآن مجید، قارئین کے سامنے آیا تھا۔

حال ہی میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے، جس کا نام ہے "مولانا ابوالاعلیٰ مودودی" اور جو منیر احمد منیر، ایڈیٹر آتش فشاں لاہور کے انٹرویوز پر مشتمل ہے۔

اس کے صفحہ نمبر ۱۵ پر منیر احمد منیر کا سید مودودی مرحوم سے انٹرویو دیا گیا ہے، جو قارئین کی خدمت میں بایں غرض پیش کیا جاتا ہے۔ کہ وہ دیکھ سکیں کہ سید مودودی مرحوم اپنی زبان سے قائداعظمؒ کے ساتھ اپنے تعلقات کی کیا نوعیت بیان فرماتے ہیں۔

س :- مولانا آپ کی قائداعظمؒ کے ساتھ کبھی ملاقات ہوئی ؟

ج :- نہیں۔

س :- کبھی نہیں ؟

ج :- کبھی نہیں۔

س:۔ قائداعظم کے ساتھ آپ کی خط وکتابت ہوئی؟

ج:۔ میری اُن سے کبھی خط وکتابت بھی نہیں ہوئی۔

اور جب آتش فشاں، کا قائداعظمؒ نمبر شائع ہوگیا تو منیر نے یہ نمبر مولانا کی خدمت میں پیش کیا، اور مزید پوچھا:

س:۔ مولانا، آپ نے کبھی قائداعظمؒ کو دیکھا بھی تھا کہ نہیں؟

ج:۔ نہیں دیکھا تو تھا۔

س:۔ کہاں؟

ج:۔ اسمبلی ڈیبیٹس کے موقع پر میں سننے چلا جاتا تھا۔

س:۔ کوئی تاثر؟

ج:۔ کچھ یاد نہیں۔

کیا اس کے بعد بھی ضرورت رہ جاتی ہے، یہ جاننے کی کہ بانیٔ پاکستان حضرت قائداعظمؒ کے ساتھ سید مودودی مرحوم کے تعلقات کیسے تھے؟

بقیہ: پرویزؒ صاحب کا پیغام

از صـ۴۹

اس کے شکریہ کے متمنی اپنے دوست سے ہو۔ یہی کیفیت اس کے کام کی ہے جسے آپ قرآنی تحریک کے لیے کرتے ہیں۔ خواہ وہ مالی خدمت ہو یا صرف محنت، یا ایثارِ وقت۔ اگر آپ یہ سمجھ لیں کہ یہ سب کچھ آپ اپنے لئے کرتے ہیں تو پھر آپ کے دل میں کسی اَجر و معاوضہ کی تمنا یا صلہ وستائش کی آرزو پیدا نہیں ہوگی۔ لیکن اگر اس سے آپ کے دل میں اس قسم کا کوئی جذبہ بیدار ہوتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ ابلیس کا افسوں ہے جس سے وہ آپ کے اعمال کو رائیگاں بنا رہا ہے۔ انسان تو ایک طرف، قرآنی ذہنیت تو اپنے خدا سے بھی یہ کہتی ہے کہ

شانِ عطا کو تیری عطا کی خبر نہ ہو یوں بھیک دے کہ دستِ گدا کو خبر نہ ہو!

(باقی آئندہ)

محمد اکرم راٹھور کراچی

محترم پرویز صاحب کا پیغام
اراکین بزمہائے طلوعِ اسلام کے نام

رفیقانِ ہمسفر، السلام علیکم!

طلوعِ اسلام کا اجراء ایک ماہنامہ کی شکل میں ۱۹۳۸ء میں وجود میں آیا۔ اس وقت اگرچہ اسکا مسلک و مقصد تحریکِ پاکستان کی تائید تھا۔ لیکن اس کی یہ تائید ایک "سیاسی مقصد" کے حصول کے لیے نہیں تھی بلکہ اسکا مؤقف یہ تھا کہ اسلام ایک دین یعنی نظام کی صورت میں اسی وقت تک زندہ ہو سکتا ہے، جب کہ مسلمانوں کی اپنی ایک آزاد مملکت ہو جس میں قرآنی اصول و اقدار کی حکمرانی ہو۔ بالفاظِ دیگر، پاکستان کا خطۂ ارض یا مملکت، اس کے نزدیک مقصود بالذات نہیں تھا۔ یہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا اور وہی بلند مقصد طلوعِ اسلام کا پیش نہاد تھا۔ تحریک پاکستان دو محاذ پر مشتمل تھا۔ سیاسی محاذ سے حضرت قائداعظم محمد علی جناح نبرد آزما تھے۔ وہ بساطِ سیاست پر اپنے مدمقابل کے مہروں کو مات دینے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے تدبر اور فراست نے دشمنوں میں ایک تہلکہ سا مچا دیا تھا۔ لیکن ایک دوسرا محاذ ایسا بھی تھا جو قائداعظم کے بس کا نہ تھا۔ یہ محاذ تھا ان مخالفین کی مدافعت کا جو قال اللہ اور قال الرسول کے نقاب میں آگے بڑھ رہے تھے۔ یہاں مقابلہ مذہبی پیشوائیت کے ان مہروں سے تھا، جنہیں جُبہ و دستار کے تقدس میں دشمن اپنا آلہ کار بنا کر آگے بڑھا رہا تھا۔ یہ تھا تحریک پاکستان کا وہ خالص دینی محاذ جس پر اس نازک دور میں طلوعِ اسلام معرکہ آراء رہا۔ اس محاذ پر اس کی معرکہ آرائیوں کی داستان محض ایک دو واقعات یا کارناموں تک محدود نہیں بلکہ دشمن نے اس محاذ پر مذہبی پیشواؤں کی ایک منظم فوج کھڑی کر رکھی تھی اور ان کے مقابلے میں بے وسے کے ایک طلوعِ اسلام تھا جو انہیں شکست پر شکست دے کر تحریک پاکستان کے دشمنوں کے منصوبے خاک میں ملاتا چلا گیا۔

حصولِ پاکستان کے بعد اس دینی محاذ نے ایک نئی صورت اختیار کر لی۔ اب سوال تھا اس مملکتِ خداداد میں دینِ خداوندی کو عملاً متشکل کرنے کا۔ قیامِ پاکستان کے بعد طلوعِ اسلام اسی مقصود و منتہیٰ

کے لیے اپنے آپ کو وقف کیے ہوئے ہے۔ اور اس مدت میں اس نے قرآنی نظامِ حیات کے خدوخال کو نکھار اور ابھار کر پیش کرنے کی سعی و کاوش برابر جاری رکھی ہے۔ یہ سعی و کاوش اب تحریکِ طلوعِ اسلام کے نام سے ایک مستقل شکل اختیار کر چکی ہے۔

قرآن کریم نے اپنی تحریک کی بنیاد فکر و شعور پر رکھی ہے۔ وہ انسان کی فکری صلاحیتوں کو ابھارتا ہے۔ انہیں سوچنے اور غور کرنے کی دعوت دیتا ہے اور دلیل و برہان سے ان کی نگاہوں میں آہستہ آہستہ تبدیلی پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ جب وہ اسطرح اس تحریک سے علیٰ وجہ البصیرت ہم آہنگ ہو جاتے ہیں تو انہیں آگے بڑھنے کی دعوت دیتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انسان جو قدم پورے غور و فکر کے بعد علیٰ وجہ البصیرت آگے بڑھائے وہ اسے پھر پیچھے نہیں ہٹایا کرتا۔

چونکہ ہماری تحریک کی بنیادیں قرآنی حقائق پر استوار ہیں اور اس کا مقصد قرآنی نظام کی تشکیل ہے۔ اس لیے اس تحریک کو عام کرنے کے لیے ہم نے طریق بھی وہی اختیار کیا ہے جسے قرآن کریم تجویز کرتا ہے یعنی فکری طریقِ عمل۔ ہم بھی ہر ایک سے بہ اتباعِ رسالت یہی کہتے ہیں کہ اِنَّمَا اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ۔ میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى۔ تم خدا کے لیے ایک ایک، دو، دو کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا (۳۴/۴۶) اس کے بعد سوچو اگر تم نے سوچنا شروع کر دیا کہ انسانیت کی منزل کونسی ہے اور ہم کس راستے پر جا رہے ہیں تو تم یقیناً قرآن کی دعوت سے متعلق ہو جاؤ گے۔

جو حضرات اس طرح ذہنی طور پر اس فکر سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں ان کے سامنے اگر مرحلہ یہ آتا ہے کہ جن حقائق کو انہوں نے ذہنی طور پر صحیح سمجھا ہے ان کے مطابق اپنے قلب میں بھی تبدیلی پیدا کریں اس لیے کہ قرآن اپنی تحریک کی کامیابی کے لیے صرف ذہنی انقلاب ہی کو کافی نہیں سمجھتا وہ اس کے ساتھ قلبی تبدیلی کو بھی ضروری قرار دیتا ہے۔ اس کا نام سیرت کی پختگی یا انسانی ذات کا استحکام ہے۔

جو احباب قرآنی فکر کے اس راستے میں ہمارے رفیقِ سفر بننے پر آمادگی ظاہر کرتے ہیں ہم کوشش کرتے ہیں کہ یہ حقیقت ان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو جائے کہ یہ راستہ بڑا صبر آزما اور استقامت طلب ہے۔ جس میں خالی جذبات کی ولولہ انگیزی کچھ کام نہیں آتی نہ صرف یہ کہ کچھ کام نہیں آتی بلکہ تخریبی نتائج پیدا کر دیتی ہے۔ میں یہ داستان اس لیے دہرا رہا ہوں کہ آپ میں سے جو احباب اپنے دل میں اس بادیہ پیمائی کا ولولہ رکھتے ہیں وہ اس مرحلہ کی شکیب آزمائی کا اچھی طرح جائزہ لے لیں اور خوب سوچ سمجھ لیں کہ دنیا میں سب سے زیادہ مشکل کام اپنے اندر انقلاب پیدا کرنا ہے

پہلے ذہنی انقلاب اور پھر قلبی انقلاب۔ اور جب تک وہ اس مرحلہ سے گذر نہیں جاتے کوئی دوسرا پروگرام ان کے سامنے نہیں آسکتا۔

۱۹۵۶ء میں بزموں کے ایک سالانہ اجتماع کا آغاز ہوا جسے طلوع اسلام کنونشن کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ان اجتماعات میں تحریک سے متعلق تنظیمی امور پر بحث وتمحیص کے علاوہ بانیٔ تحریک محترم پرویز صاحب اراکین طلوع اسلام سے خصوصی خطاب فرماتے تھے۔ یہ خطابات درحقیقت تحریک طلوع اسلام کی تاریخ کا سنہری باب ہیں۔ آج کی نشست میں، میں محترم باباجی کے ان خطابات سے چیدہ چیدہ اقتباسات پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ اس سے جہاں تحریک طلوع اسلام کے بنیادی خدوخال ہمارے ذہنوں میں تازہ ہو جائیں گے وہاں تحریک طلوع اسلام کے تعارف کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوں گے۔

طلوع اسلام کی پہلی کنونشن ۱۵ تا ۱۹ نومبر ۱۹۵۶ء لاہور میں منعقد ہوئی تھی جس میں محترم پرویز صاحب نے اراکین بزمہائے طلوع اسلام سے پہلا خطاب 'بادہ زندگی' کے عنوان سے کیا تھا۔ تحریک کی سست رفتاری پر شکوہ سنج احباب کو مخاطب کرتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے فرمایا۔

"بعض حضرات کہا کرتے ہیں کہ اگر ہم نے اس فکر کو عام بھی کر دیا تو اس سے کیا حاصل ہوگا۔ قرآن کا مقصد تو اس نظام کو عملاً متشکل کرنا ہے۔ کیا اس فکر کی عام نشر و اشاعت سے یہ نظام متشکل ہو جائے گا؟ ان کی خدمت میں گذارش ہے کہ اب تو خود زمانہ کے تقاضوں نے حالات میں ایسی تبدیلی پیدا کر دی ہے کہ کسی خیال کے عام کر دینے سے معاشرہ کا نظام خود بخود متشکل ہو جاتا ہے۔ یہ زمانہ جمہوریت کا ہے جس میں انقلاب آئینی طور پر (CONSTITUTIONALLY) بپا ہوتے ہیں۔ جمہوریت کے معنی یہ ہیں کہ جس خیال کے حامل زیادہ ہوں اسی کے مطابق نظام مملکت متشکل ہو جائے۔ آپ اس فکر کو عام کیجئے اور پھر دیکھئے کہ کس طرح ایک قطرہ خون بہائے بغیر یہ انقلاب معرضِ وجود میں آجاتا ہے۔ قرآنی نظامِ ربوبیت خود اپنے اندر اتنی قوت رکھتا ہے کہ دنیا کا کوئی اور نظام یا تصور اس کے سامنے ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے ابھی تک دنیا کے سامنے پیش ہی نہیں کیا گیا۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ جو حضرات اسے دوسروں کے سامنے پیش کریں وہ خود اسے اچھی طرح سمجھے ہوئے ہوں۔ اس لیے کہ تجربہ نے یہ بتایا ہے کہ اس تحریک کو اتنا نقصان مخالفین کے ہاتھوں سے نہیں پہنچتا جتنا ان موافقین کی طرف سے پہنچتا ہے جو اس کی ماہیت سے خود اچھی طرح واقف نہیں ہوتے۔

ان کی یہی باتیں مخالفین کے لیے اعتراضات کا موجب بن جاتی ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ حضرات کی خود قرآن پر نگاہ ہو، ایسی نگاہ کہ اگر کبھی میں بھی غلطی سے کوئی ایسی بات کہہ دوں جو قرآن کے مطابق نہ ہو تو آپ مجھے فوراً ٹوک دیں۔ یاد رکھیے! دین میں سند اور حجت میرا بھی کوئی قول نہیں ہو سکتا۔ سند اور حجت صرف خدا کی کتاب ہو سکتی ہے۔"

طلوع اسلام کی سالانہ کنونشن ۱۸ تا ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۷ء راولپنڈی میں منعقد ہوئی۔ اس کنونشن میں محترم پرویز صاحب نے اراکین بزمہائے طلوع اسلام سے "خم زندگی" کے عنوان سے خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

"..... اس ضرورت اور احتیاط کی اہمیت کے پیش نظر، برادران! میں نے اب یہ مناسب سمجھا ہے کہ بزموں کے نظم و نسق اور باہمی ربط و ضبط کے متعلق کچھ ہدایات منضبط کر دی جائیں تاکہ اُن سے مخلص رفقائے سفر کو راہ نمائی مل سکے۔ یہی ہدایات سردست آپ کے لیے دستور و آئین کا کام دیں گی۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ ان ہدایات کو بغور پڑھ لیں۔ جو حضرات ان سے متعلق ہوں وہ آپنے آپ کو بزم طلوع اسلام سے متمسک رکھیں۔ جو یہ سمجھیں کہ اس سے ان کا دائرہ فکر و عمل تنگ ہو جائے گا، وہ اپنی تگ و تاز کے لیے دوسرے میدان کو تجویز کر لیں۔ قرآنی فکر و عمل طلوع اسلام کی اجارہ داری نہیں۔ جن کے دل میں اس کی لگن ہو وہ جو لائحۂ عمل اور طریق کار اپنے لیے مناسب سمجھیں، اختیار کر سکتے ہیں لیکن (آپ مجھ سے متفق ہوں گے) کہ یہ ضروری ہے کہ جب تک کوئی شخص بزم طلوع اسلام سے وابستہ رہے اس کے لیے طلوع اسلام کی طرف سے نافذ کردہ ہدایات کی پابندی لازم ہو گی۔ یہ صورت تو کسی کے نزدیک بھی قابلِ قبول قرار نہیں پا سکتی کہ آپ ممبر تو ہوں بزم طلوع اسلام کے اور اپنے فکر و عمل میں طلوع اسلام کے مسلک و مقصد اور ہدایات و ضوابط کے خلاف چلیں ۔۔۔"

(اصولی ہدایات بزمہائے طلوع اسلام ماہنامہ طلوع اسلام ماہ نومبر ۱۹۵۷ء کے شمارہ میں شائع ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ طلوع اسلام نے انہیں علیحدہ بھی کئی بار شائع کیا ہے۔)

طلوع اسلام کی تیسری سالانہ کنونشن ۹ تا ۱۱ اپریل ۵۹ء لاہور میں منعقد ہوئی جس میں محترم پرویز صاحب نے "پیامِ فصلِ بہار" کے عنوان سے اراکینِ بزمہائے طلوعِ اسلام کو خطاب

کیا۔ موصوف نے اسلامی آئین کی تدوین کے بنیادی اصول پیش کرتے ہوئے فرمایا:

"لہٰذا آپ سوچئے کہ اس وقت آپ پر کتنی عظیم ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ یہ ذمہ داری آپ سے کسی لمبی چوڑی قربانی کی بھی خواہاں نہیں۔ اس کا تقاضا فقط یہ ہے آپ اسلامی آئین کے قرآنی تصور کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائیں۔ اس مقصد کے لیے آپ اپنی بے سروسامانی سے مت گھبرائیے۔ آپ کے دعوے کی صداقت، آپ کی نیتوں کا خلوص آپ کے عزم کی پختگی، آپ کے عمل کی مداومت، آپ کے ذرائع کی کمی کو پورا کر دے گی۔ خدا کا کائناتی قانون، آپ کی دفاقت کا تھوڑا سا سہارا چاہتا ہے۔ آپ اس سے ہم آہنگی پیدا کیجیے اور پھر دیکھئے کہ اس کے نتائج کس قدر تحیر انگیز برآمد ہوتے ہیں۔ قدم بڑھائیے، زمانہ آپ کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہا ہے۔

اسلام کے دشمن دانستہ اور نادان دوست نادانستہ، ٹھنڈے سانس بھر کر کہہ رہے ہیں کہ اس دور میں قرآنی نظام ناقابل عمل ہے۔ تاریخ کے ایک دور میں تو اس نے شاندار نتائج پیدا کر دکھائے تھے لیکن اب زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ اب یہ "چلا ہوا کارتوس" کوئی نتیجہ مرتب نہیں کر سکتا۔ یہ آوازیں ادھر ادھر سے سنائی دے رہی ہیں اور عوام کے دلوں میں مایوسی پیدا کیے چلی جا رہی ہیں۔ آپ احباب کی ذمہ داری ہے کہ زمانہ کو بتا دیں کہ جو کچھ قرآن نے ایک دور میں کیا تھا اس میں آج بھی اس کی صلاحیت ہے اور ہمیشہ اس کی صلاحیت رہے گی کہ ویسے ہی درخشندہ نتائج پھر مرتب کر دکھائے۔"

طلوع اسلام کی چوتھی سالانہ کنونشن جو ۷ تا ۹ اپریل ۱۹۶۰ء لاہور میں منعقد ہوئی اس میں "معمارِ حرم" کے عنوان سے خطاب فرمایا۔ جس میں تحریک طلوعِ اسلام کی تنظیم پر روشنی ڈالتے ہوئے موصوف نے فرمایا:

اب مجھے برادران عزیز! آپ سے کچھ باتیں اپنی تحریک و تنظیم کے متعلق کہنی ہیں۔ جیسا کہ میں شروع سے کہتا چلا آ رہا ہوں کہ اس تحریک کا تعلق نہ تو کسی سیاسی پارٹی سے ہے اور نہ مذہبی فرقے سے۔ یہ تو قرآنی فکر کو عام کرنے کی ایک منظم کوشش ہے۔ جہاں تک اس قرآنی فکر کا تعلق ہے جو ہماری طرف سے پیش کی جاتی ہے، اس کی بابت اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اگر آپ اس فکر کو اس لیے صحیح سمجھتے ہیں کہ وہ میری فکر ہے۔ یعنی آپ کے پاس اس کے صحیح ہونے

کی سند یہ ہے کہ ایسا پرویز صاحب کہتے ہیں تو یاد رکھیے کہ آپ نے نہ قرآنی فکر کو سمجھا ہے، نہ اس تحریک کو۔ کیونکہ قرآنی فکر کے لیے نہ "پرویز صاحب" سند ہو سکتے ہیں نہ کوئی اور انسان میں اپنی بصیرت کے مطابق قرآنی فکر پیش کرتا ہوں۔ آپ کے لیے ضروری ہے کہ آپ از خود قرآن کریم پر غور و فکر کے بعد فیصلہ کریں کہ میری فکر صحیح ہے یا نہیں۔ اگر آپ اس طرح غور و فکر کے بعد اسے صحیح سمجھتے ہیں تو اسے مانیے کہ آپ کا اسے اس طرح صحیح ماننا، میری سند سے نہیں ہوگا بلکہ براہ راست قرآن کریم کی سند سے ہوگا۔ اسے اچھی طرح سن رکھیے کہ جس دن آپ نے دین کے معاملہ میں قرآن کریم کی بجائے کسی انسان کو سند مان لیا، آپ نے فرقہ بندی کی بنیاد رکھ دی اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ فرقہ پرستی قرآن کی رُو سے شرک ہے۔ جو احباب اس طرح غور و فکر کے بعد طلوع اسلام کی طرف سے پیش کردہ قرآنی فکر کو صحیح سمجھیں، ان کی باہمی تنظیم کا نام "بزم طلوع اسلام" ہے۔ جس کا مقصد اس فکر کو عام کرنا ہے۔ اراکین بزم کے لیے ضروری ہے کہ وہ آپس میں محبت اور مودّت سے رہیں۔ ان کی زندگی "رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ" کی جتنی جاگتی تصویر ہو۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انہیں ایک دوسرے پر بھروسہ ہو۔ نصب العین کی وحدت اس قسم کا بھروسہ پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ آپ تنظیمی معاملات میں چھوٹے چھوٹے اختلافات کو اہمیت نہ دیں۔ اپنی بات منوانے پر ضد نہ کریں۔ دوسرے کو اپنے دل میں سمو لینے کے لیے آخری حد تک کوشش کریں۔ یاد رکھیے آپ کی تسبیح کا ایک ایک دانہ بڑا قیمتی ہے۔ یہ منتشر موتی خدا خدا کر کے اکٹھے ہوئے ہیں، انہیں بکھرنے نہ دیجیے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھیے کہ جو شخص آپ کی پیش کردہ قرآنی فکر سے یکسر متفق نہ ہو، اسے اپنے ساتھ رکھنے میں کوئی فائدہ نہیں۔ آپ کی یہ تنظیم پولیٹیکل پارٹیوں کی تنظیم سے بالکل مختلف ہے۔ پولیٹیکل پارٹیز کی تقویت کا راز ممبران کی تعداد میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ وہاں ووٹ گنے جاتے ہیں اور انہیں کے شمار سے پارٹی کا مقام متعین ہوتا ہے۔ اس لیے پولیٹیکل پارٹیوں کو ضرورت ہوتی ہے کہ وہ ان کی تائید میں ہاتھ اٹھانے والوں کو ہر قیمت پر اپنے ساتھ رکھیں لیکن آپ کی تنظیم ہم آہنگیٔ فکر و نظر کی بنیادوں پر استوار ہے۔ اس لیے جو شخص اس

قرآنی فکر کو عام کرنے میں دل و جان سے آپ کے ساتھ شریک نہیں، اسے باندھ کر ساتھ رکھنے سے کچھ حاصل نہیں۔ قرآن کی محبت جس شخص کے دل کی گہرائیوں میں اتر چکی ہے۔ وہ اگر کسی وقت ہنگامی جذبہ سے مغلوب ہو کر، آپ سے علیحدگی بھی اختیار کر لیتا ہے۔ تو وہ زود یا بدیر آپ کے ساتھ شامل ہو جائے گا۔ اس لیے کہ ایسی رفاقت اسے کہیں اور نہیں مل سکے گی۔

طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن ۷ تا ۹ اپریل ۱۹۶۱ء بھی لاہور میں منعقد ہوئی۔ اس میں "مژدۂ صبح" کے زندگی بخش عنوان سے خطاب فرماتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے فرمایا:

برادرانِ عزیز! ..... اس مقام پر میں آپ کی خدمت میں ایک بنیادی نکتہ پیش کروں گا۔ دنیا کے عام پروگراموں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جوں جوں وہ کامیابی کے قریب پہنچتے جاتے ہیں، سفر کی صعوبتیں کم ہوتی جاتی ہیں۔ لیکن قرآنی نظام کے پروگرام کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں کامیابی و کامرانی مزید ذمہ داریوں کا موجب بنجاتی ہے۔ سورۂ النصر اس کی زندہ شہادت ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ ..... اَفْوَاجًا۔ جب اللہ کی نصرت قریب آجائے اور فتح و کامرانی سامنے کھڑی دکھائی دے۔ اور تو دیکھے کہ لوگ فوج در فوج نظامِ خداوندی میں داخل ہو رہے ہیں، تو یہ نہ سمجھ لینا کہ بس اب ہمارا کام ختم ہو گیا۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ ..... كَانَ تَوَّابًا ۱۱۰/۳۔ اس وقت نظامِ خداوندی کو وجہِ حمد و ستائش بنانے کے لیے اور بھی سرگرمی سے مصروفِ عمل ہو جاؤ۔ اور مخالف قوتوں سے حفاظت طلبی میں اور بھی شدت سے کوشش کرو۔ تم یہ کرو اور پھر دیکھو کہ خدا کی رحمتیں کس تیز خرامی سے تمہاری طرف لوٹ کر آتی ہیں۔ یعنی جسوقت یہ پروگرام منزل تک پہنچ جائے اور اسے قبولیتِ عامہ حاصل ہو جائے تو اس کے بعد بھی تمہاری جد و جہد کا سلسلہ جاری رہے گا۔ ہمارے سامنے تو منزل ابھی آئی ہی نہیں۔ ابھی صرف اس کے دھندلے سے نقوش دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے ہمارے لیے ابھی بہت کام باقی ہے۔ آپ صرف اتنا دیکھیے کہ آپ نے جو تھوڑی بہت کوشش کی ہے۔ اس کا نتیجہ کس قدر حوصلہ افزا اور اطمینان بخش ہے۔ اگر ہم اپنی کوششوں کی رفتار اور تیز کر دیں تو پھر دیکھیے کہ ان کے نتائج کسقدر تحیر انگیز اور مسرت خیز ہوتے ہیں۔ آپ ذرا سی ہمت اور کیجیے۔ پھر دیکھئے کہ کس طرح یہ

حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آتی ہے۔

آخر میں، میں اپنی اس مخلصانہ اپیل کو ایک بار پھر دہراؤں گا کہ

۱۔ اپنے ذہن میں کسی غیر قرآنی تصور و خیال کو جاگزیں نہ ہونے دو۔

۲۔ اپنے قول سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے بھی ثابت کرو کہ قرآن کی تعلیم انسان کو کس بلند مقام پر لے جاتی ہے۔

۳۔ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دو۔ لیکن جو کچھ کرو خالصتہً لوجہ اللہ کرو۔ اس میں کسی ذاتی مفاد یا جذبہ کو دخل انداز نہ ہونے دو۔

۴۔ ہم سے کسی قسم کی کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے جس میں فرقہ بازی یا پارٹی بازی کا شائبہ تک بھی پایا جائے۔ اپنے دامن کو ان خار دار جھاڑیوں سے قطعاً نہ الجھنے دو۔

۵۔ اپنے وقت اور توانائی کو، ضدی طبقے کے ساتھ بحث و تمحیص میں ضائع نہ کرو۔ قرآنی تعلیم کو صرف ان لوگوں کے سامنے پیش کرو جو علم و بصیرت سے سمجھنے اور سنجیدگی سے اس پر غور کرنے کے لیے تیار ہوں۔

۶۔ آپس میں محبت اور پیار، مودت اور الفت کے ساتھ رہو کہ دنیا میں قرآنی رشتے سے زیادہ پاکیزہ اور گہرا رشتہ اور کوئی نہیں۔

طلوع اسلام کی سالانہ چھٹی کنونشن ۱۳ تا ۱۵۔ اپریل ۱۹۶۲ء گلبرک لاہور میں منعقد ہوئی۔ اس موقع پر "شعلۂ نمناک" کے عنوان سے محترم پرویز صاحب نے علامہ اقبال کے اس شعر کی تفسیر فرمائی ہے جس میں موصوف نے کہا تھا کہ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اس لیے اس خطاب کے چند اقتباسات پیش کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے خوشبو کی تلاش میں پتی کا مسل دینا ہے۔ اس لیے میں اس خطاب کو کچھ تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ تحریکِ طلوعِ اسلام کی سست روی کا گلہ کرنے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے محترم

پرویز صاحب نے فرمایا:

"اس ضمن میں عزیزانِ من! میں ایک اہم نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ میں سے جو حضرات کچھ عرصہ سے اس تحریک کے ساتھ وابستہ ہیں، وہ تو اس حقیقت کو سمجھ چکے ہیں لیکن نووارد احباب جو ایک خاص ولولہ لے کر

شریک محفل ہوتے ہیں انہیں اس نکتہ کے سمجھنے میں ذرا وقت لگتا ہے۔ جو کچھ میں اس مقام پر کہنا چاہتا ہوں۔ اس کا اولین مخاطب یہی طبقہ ہے۔ ان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے کوئی عملی پروگرام نہیں۔ جیسا کہ میں اس سے پہلے بھی متعدد بار عرض کر چکا ہوں۔ ہمارے ہاں ہنگامی تحریکوں اور سیاسی جماعتوں نے اس قسم کا تصور عام کر رکھا ہے کہ جس پروگرام میں ہنگامہ خیزیاں اور شور انگیزیاں نہ ہوں، وہ پروگرام عملی نہیں ہوتا۔ عملی پروگرام کے لیے، بگولوں کا سا رقص اور طوفان کا سا جوش و خروش ضروری ہے۔ طلوع اسلام اپنی نوعیت کی پہلی اور منفرد تحریک ہے جس کا مقصد لوگوں کے قلب و نگاہ میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ اس لیے اس نے قرآن کریم کی تعلیم سے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (۱۳/۱۱) جب تک کسی قوم میں نفسیاتی تبدیلی نہیں ہوتی، اس کی حالت نہیں بدل سکتی۔ طلوع اسلام کا مقصد قوم میں اس نفسیاتی تبدیلی کا پیدا کرنا ہے۔ اور یہ مقصد ہنگامہ آرائیوں سے حاصل نہیں ہو سکتا، خاموش لیکن استقامت آمیز تبلیغ سے ہو سکتا ہے۔ لاہور کا تو مجھے علم نہیں لیکن کراچی میں برسوں تک ایک عجیب منظر دکھائی دیتا رہا۔ شام کے وقت شہر کی سب سے بارونق سڑک الفنسٹن سٹریٹ کے چوراہے پر ایک کونے میں، ایک یورپین نوجوان خاموش کھڑا دکھائی دیتا۔ عمدہ سوٹ میں ملبوس ایک تھیلا گلے میں لٹکائے اور ہاتھ میں ایک پمفلٹ لیے خاموش کھڑا رہتا۔ اگر کسی نے پمفلٹ مانگا تو اس نے زبان سے ایک لفظ کہے بغیر ہاتھ والا پمفلٹ اسے دے دیا اور ایک اور پمفلٹ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ میں نے اسے ہفتوں، مہینوں، برسوں اسی طرح دیکھا۔ اس قسم کے اور نوجوان بھی شہر کے مختلف مقامات پر اسی طرح کھڑے ملتے۔ یہ ایک عیسائی تبلیغی ادارہ کے مشنری تھے۔ لوگ ان کی اس "بے معنی" حرکت کا مذاق اڑاتے۔ لیکن جب ان کی رپورٹ شائع ہوتی تو اس سے معلوم ہوتا کہ ان کی وہ خاموش تبلیغ کس قدر گہرا اور وسیع اثر کرتی جا رہی ہے۔ وہ دراصل اس طرح متجسس لوگوں کا رُخ اپنے مرکزی ادارہ کی طرف موڑ دیتے تھے۔

عملی پروگرام

خاموش تبلیغ

ہمارے سامنے بھی برادران عزیز! اسی قسم کا پروگرام ہے۔ ہمارا مقصد قرآنی

تعلیم کی تبلیغ ہے۔ یعنی اس فکر کو خود سمجھنا اور سمجھنے کے بعد دوسروں تک پہنچانا — لٹریچر کے ذریعے پہنچانا اور معاملات میں اپنے حسنِ کردار کے ذریعے اس کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچانا۔ اس پروگرام کا میدان اس قدر وسیع ہے کہ یہ ختم ہی نہیں ہو سکتا۔ لیکن قرآنی پروگرام اور ان خاموش مشنریوں کے پروگرام میں ایک بنیادی فرق ہے۔ وہ خاموش کھڑے رہ کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے تھے۔ یہ زندگی کا منفیانہ پہلو (NEGATIVE ASPECT) ہے اور عیسائیت کی خصوصی تعلیم۔ قرآن مثبت پہلو (POSITIVE ASPECT) کو سامنے لاتا ہے اور اسی کو صحیح طریق قرار دیتا ہے۔ یہ وہ طریق ہے جو ملتِ اسلامیہ کے مؤسس حضرت ابراہیمؑ کو خدا کی طرف سے اس وقت ملا جب آپ نے قوم کی حالت سے شدید طور پر متاثر ہو کر بدرگاہِ رب العزت عرض کیا کہ، رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی مجھے بتا کہ اس قسم کی بے حس اور مردہ قوم کس طریق سے زندہ ہوگی؟ وہ طریق کیا تھا؟ یہ کہ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ۔ یعنی وہی طریق جس سے وحشی پرندوں کو سدھایا جاتا ہے۔

ہمارا پروگرام

ان پرندوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے سائے سے بھی دور بھاگتے ہیں۔ ذرا سی آہٹ ہوئی اور وہ جھٹ سے اڑ گئے۔ ان پرندوں کو سدھانے کے لیے خاموش کھڑے رہنے سے کام نہیں چل سکتا۔ انھیں حسنِ سیرت سے اپنے سانچے اس قدر مانوس کرنا پڑتا ہے۔ کہ آپ انھیں کھلی فضا میں چھوڑ کر جہاں جی چاہے چلے جائیں۔ ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا (۲/۲۶۰) آپ کی آواز پر وہ دوڑتے ہوئے آپ کی طرف آجائیں گے۔ یہ مثبت پروگرام ہے۔ لیکن اس میں ہنگامہ آرائی کا کوئی دخل نہیں۔ دخل تو ایک طرف اگر انھیں سدھانے کے دوران میں کہیں ذرا سی ہچکچاہٹ آجاتے یا آپ سے کوئی خلافِ معمول اور غیر مانوس خفیف سی حرکت سرزد ہو جائے تو وہ فوراً بدک جائیں گے لہٰذا اس کے لیے نہایت صبر و سکون کے ساتھ ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق چلتے جانا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے ندی کی سی روانی اور چٹان کی سی استقامت کی ضرورت ہوگی۔ یہی ہمارا پروگرام ہے اور اسی پر ہمیں کاربند رہنا ہے۔ اس تبلیغ کے ذرائع میں عندالضرورت اور حسبِ اقتضائے وقت تبدیلی آتی رہے گی لیکن کسی بے تابیٔ تمنا کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ہمارے پروگرام میں ہنگامہ آرائی کا دخل کبھی نہیں ہوگا۔ جو احباب اس پروگرام میں شریک ہونا چاہیں، انھیں اس

بلبلا دی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ یہاں پروانے کی طرح جلنا ہے. مرغِ سحر کی طرح شور نہیں مچانا۔

اس سلسلہ میں ایک اور ضروری بات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں، اور ان کا تعلق بیشتر قدامت پرست مذہبی طبقہ سے ہوتا ہے، کہ تعصب، ضد اور ہٹ دھرمی

ضدی لوگ

جن کا شعار ہوتا ہے اور انھوں نے پہلے ہی فیصلہ کر رکھا ہوتا ہے کہ ہم نے کسی کی سننی ہی نہیں ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہہ دیا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ ءَ اَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (۲/۶) جو لوگ پہلے ہی سے فیصلہ کیے بیٹھے ہوں کہ کچھ بھی ہو، ہم نے کسی کی بات ماننی ہی نہیں، انھیں ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا جائے یا نہ کیا جائے، ...... ان کے لیے یکساں ہے۔ وہ کبھی صداقت کی بات نہیں مانیں گے۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیا گیا تھا کہ وَاھْجُرْھُمْ ھَجْرًا جَمِیْلًا۔ (۷۳/۱۰) ان سے نہایت حسن کارانہ انداز سے کنارہ کشی اختیار کر لو۔ اس قسم کی جامد، متعصب اور ضدی ذہنیتوں کے سامنے قرآنی فکر پیش کرنے میں اپنا وقت اور توانائی ضائع نہیں کرنی چاہیے۔ اگر ذرا دقتِ نظر سے کام لیا جائے تو ایسے لوگوں کو پہچاننے میں چنداں دشواری نہیں ہوتی۔ قرآنی فکر ان لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیے جو زندگی کے عملی مسائل میں غور و فکر کرنے اور علم و بصیرت کی رو سے انسانیت کی مشکلات کا حل دریافت کرنے کے متمنی اور آرزومند ہوں۔ قرآن کا خطاب ہی ان لوگوں سے ہے جن میں زندگی کی کچھ رمق اور حرارت ہے۔ لِیُنْذِرَ مَنْ کَانَ حَیًّا (۳۶/۷۰) یہی وہ ذہن ہے جس میں اس فکر کا تخمِ صالح شجرِ طیّب بن کر پھولتا پھلتا ہے۔

دوسری بات جس کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا ضروری ہے وہ اس سے بھی اہم ہے۔ مثل مشہور ہے کہ نادان دوست سے دانا دشمن اچھا۔ دانا دشمن کس طرح اچھا ہوتا ہے۔ اس کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن نادان دوست کسقدر نقصان پہنچاتا ہے، اس کا تجربہ مجھے آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ ہمارے یہ "نادان دوست" ہماری تحریک سے

ہمارے نادان دوست

وابستہ ہیں۔ ان میں سے بعض بزموں کے ممبر بھی ہیں۔ طلوعِ اسلام کا مدت سے

مطالعہ کرتے ہیں۔ لٹریچر کے مطالعہ کرنے کا دعوے بھی کرتے ہیں۔ لیکن حالت ان کی یہ ہے کہ وہ طلوع اسلام کی تحریک، اس کی پیش کردہ قرآنی فکر اور خود میرے متعلق ایسے ایسے عقاید و نظریات لوگوں سے بیان کرتے ہیں جنہیں سُن کر میں محوِ حیرت رہ جاتا ہوں، اور دُعا کرتا ہوں کہ

خدا مجھے میرے ان دوستوں سے بچائے!

میرا اندازہ ہے کہ آپ کی تحریک کو اتنا نقصان آپ کے مخالفین کے سب وشتم سے نہیں پہنچتا، جتنا ان متفقین کی نوازشہائے بیجا سے پہنچتا ہے۔ یہ عصرات تحریک کے لیے بڑے ہی خطرناک واقع ہوئے ہیں اور ان کی اس حرکت کی روک تھام نہایت ضروری ہے۔ اس کا طریق یہ ہے کہ

(۱) جب آپ سے کوئی شخص .... ، تحریک، اس کے نظریات یا میرے عقاید و مسالک کے متعلق کچھ پوچھے تو یہ دیکھے کہ اس کا جواب ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کسی کتاب رسالہ یا پمفلٹ میں ہے؟ اگر ہو تو دریافت کرنے والے سے کہیئے کہ میں فلاں تحریر آپ تک پہنچا دوں گا۔ اس میں آپ کو اس بات کا جواب مل جائے گا۔

میں مختلف بزموں کے نمائندہ حضرات سے درخواست کروں گا کہ وہ براہ کرم اپنے اراکین پر اس سلسلہ میں کڑی نظر رکھیں اور اگر کوئی رکن اس کے خلاف ورزی کرے تو اس سے مواخذہ کریں۔ اگر کوئی رکن تنبیہہ کے باوجود اس سے باز نہ آئے تو سمجھ لیجئے کہ وہ آپ کے ساتھ شامل ہی آپ کی تحریک کو نقصان پہنچانے کیلئے ہوا ہے۔ تحریک کو اس سے بچاتے رہیئے۔

اس مقام پر میں یہ اعلان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ طلوع اسلام صرف ان باتوں کا ذمہ دار ہے جو اس نے اپنی تحریروں میں پیش کی ہیں۔ ان کے علاوہ وہ کسی بات کا بھی ذمہ دار نہیں، خواہ اسے کوئی بھی اس کی طرف منسوب کیوں نہ کرے۔

اب میں عزیزانِ من! اس خطاب کے سب سے اہم گوشے کی طرف آتا ہوں آپ قرآنی تعلیم کو صحیح طور پر سمجھنے کا ولولہ اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ یہ بڑی مبارک بات ہے۔ لیکن

ہماری عملی زندگی

قرآن کریم کا صحیح مفہوم ہماری سیرت و کردار میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا تو یہ ذہنی تفریح سے زیادہ

کچھ نہیں۔ اگر اس سے ہمارے قلب کی گہرائیوں میں کوئی ایسا انقلاب پیدا نہیں ہوتا جس کی جھلک ہماری روزمرہ کی زندگی میں نہ پائی جائے تو ایسی قرآن فہمی محض مشاعروں کی داد ہے۔ جس سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔

خرد نے کہہ بھی دیا لَا اِلٰہَ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

دل و نگاہ کی اس مسلمانی کا مظاہرہ ہماری گفتار و کردار سب میں ہونا چاہیے اگر ہماری سیرت پاکیزہ، نگاہ بلند، کردار پختہ اور معاملات صاف نہیں تو ہم میں اور ان لوگوں میں کیا فرق ہے جن کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ وہ قرآن کی تعلیم کو صحیح طور پر نہیں سمجھتے بجز اس کے کہ ہم اپنے آپ کو یہ کہہ کر فریب دے لیں کہ ہم ان سے بہت آگے ہیں۔ کیونکہ ہم قرآنی تعلیم کو ان سے بہتر سمجھتے ہیں۔ قرآن کو سمجھنے والوں کی زندگیاں ایسی ہونی چاہیئے جن سے وہ چلتے پھرتے دوسروں سے ممتاز اور متمیز نظر آئیں۔ اور جس کسی کو ان سے کبھی واسطہ پڑے وہ ان کے حسنِ معاملہ سے متاثر ہو کر بے ساختہ پکار اُٹھے کہ

دیدم مردے دریں قحط الرجال

اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے پیش نظر پورے کے پورے معاشرہ میں قرآنی انقلاب پیدا کرنا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جب تک معاشرہ میں ایسا انقلاب نہ آجائے ہم اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہ کریں۔ غلط معاشرہ کی بعض مجبوریاں ایسی ہوتی ہیں جن پر انفرادی طور پر قابو پانا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن زندگی کے جن دائروں میں ہم مجبور نہیں، وہاں کونسی چیز مانع ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے اندر حسنِ سیرت پیدا نہ کریں! اپنی ہر کمزوری کے لیے معاشرہ کی مجبوری کو سپر بنا لینا، بہت بڑی خود فریبی ہے۔ قرآن کا نام لینے والوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے آپ کو اس قسم کی خود فریبی میں مبتلا رکھیں۔ صداقت، اخوت، محبت، شفقت، حسنِ معاملہ، ایفائے عہد، کشادہ ظرفی، وسعت ظرف، تحمل، بردباری، پاکیزگی، عمدہ خیالات، عفتِ قلب و نظر۔ یہ ہمارے امتیازی نشان ہونے چاہیں، میں نے ان چند خصوصیات کا ذکر محض مثال کے طور پر کیا ہے۔ مجملاً یوں سمجھیئے کہ ہماری ساری زندگی سیرتِ محمدیہ کے قالب میں ڈھلی ہوئی ہونی چاہیئے۔ کہ قرآن فہمی کا فطری نتیجہ یہی ہے۔

اگر بایں نرسیدی تمام بولہبی است

یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارا رہن سہن نہایت پروقار اور سنجیدہ ہو۔ اور ہم سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہونے پائے جو پایۂ ثقاہت سے گری ہوئی ہو۔ آپ چلتے پھرتے شریف انسان دکھائی دیں جو خود بھی امن وسلامتی میں رہیں اور دوسروں کے لیے بھی امن وسلامتی کے پیامبر اور آرزومند ہوں۔ آپ کے ہاتھ سے کسی پر ظلم اور زیادتی نہ ہو۔ اس کے برعکس عدل اور احسان آپ کا شیوۂ زندگی ہو۔

یہ بھی ضرور ہے کہ آپ سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے جس سے اس خطۂ زمین کے استحکام میں ضعف آنے پائے۔ اس لیے کہ ہماری درخشندہ امیدیں اور تابناک آرزوئیں اس خطۂ زمین سے وابستہ ہیں۔ ہم جس جنتی معاشرہ کا قرآنی تصور عام کر رہے ہیں اس کی عملی تشکیل اسی خطہ میں ہو سکے گی۔ عام لوگوں کے لیے یہ خطۂ زمین محض ایک مملکت ہے۔ لیکن ہمارے لیے قرآنی زندگی بسر کرنے کا لاینفک ذریعہ اور نوع انسان کو موجودہ جہنم سے نکالنے کا دروازہ۔ اس سے ہمارے نزدیک اس کی سالمیت کی اہمیت واضح ہے۔ ہمارے ایک طرف ہندو جیسے تنگ نظر دشمن کے مذموم عزائم ہیں جو اپنی کئی جنگوں کی خلامی اور محکومی کا انتقام ہم سے لینا چاہتا ہے اور دوسری طرف روسی کیمونزم کا بلائے بے درماں ہے۔

پاکستان کا استحکام

طلوع اسلام کی ساتویں سالانہ کنونشن ۱۱ تا ۱۴ اپریل ۱۹۶۳ء کو شاہ جمال کالونی لاہور میں منعقد ہوئی "قیامتِ موجود" کے عنوان سے محترم پرویز صاحب نے اراکین بزمہائے طلوع اسلام سے خطاب فرماتے ہوئے کہا۔

طلوع اسلام کا پروگرام یہ ہے کہ ہم نہایت پرامن اور آئینی طریق سے قرآنی فکر کو عام کرتے جانا چاہتے ہیں۔ اس سے زیادہ ہمارے پیشِ نظر کوئی پروگرام نہیں ... حتےٰ کہ ہم ملک کی عام عملی سیاست میں بھی حصہ نہیں لیتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس دور میں کسی فکر کی نشر واشاعت کے لیے جس قدر سامان وذرائع کی ضرورت ہوتی ہے، ہمارے پاس اس کی بے حد کمی ہے۔ لیکن وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ تم دین کی آواز بلند کرنے کے لیے اٹھو تو کائناتی قوتیں تمہارا ساتھ دیں گی، کچھ اس کا اثر ہے کہ سامان وذرائع کی اس قدر کمی کے باوجود قرآن کی آواز جس تیزی سے پھیلتی جا رہی ہے وہ ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ تھی۔

آپ ذرا دس بیس برس پہلے ادھر کا نقشہ سامنے لائیے اور پھر آج کی فضا پر غور کیجیئے، آپ کو نظر آجائے گا کہ یہ آواز کس طرح خاموشی ہی خاموشی سے ہر گوشے کو متاثر کیے جا رہی ہے۔

موصوف نے فرمایا!

یہ بات کے چل نکلنے کا نتیجہ ہی تو ہے کہ قرآن کی عظمت و صداقت کے معترف تو ایک طرف، اس آواز کے شدید ترین مخالف بھی اپنے مواعظ اور تقاریر میں قرآن کی آیات، دین کی اصطلاحات اور نظامِ خداوندی کے استعارات، استعمال کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

جنابِ شیخ او [illegible] سہی لیکن
کسی بہانے لبِ جو نکل ہی آتے ہیں۔

برادرانِ من! آپ نے قرآن کی آواز کو آگے بڑھانے کے لیے جو کچھ کیا ہے اس کا میرے دل پر خاصا اثر ہے۔ آپ نے سخت نامساعد حالات میں اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کے باوجود اس دیئے کو اپنے خون سے روشن رکھا ہے۔ اس کے باوجود مجھے کہنے کی اجازت دیجیئے کہ قرآن کریم ہم سے جو توقعات وابستہ رکھتا ہے، ہم انہیں کما حقہ، پورا نہیں کر رہے۔ یہ تو اس کی کشادہ نگہی اور وسعت ظرف ہے جو ہمیں وہ اپنے دامن سے جھٹک نہیں دیتا۔ ورنہ حق بات تو یہی ہے کہ ہم اس کے معیار پر پورے نہیں اُترتے،

محترم پرویز صاحب نے اراکین بزم سے درخواست کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

(قرآن کے) وابستگان دامن کو تو، جان اور مال دونوں اس کے ہاتھوں بیچ دینے پڑتے ہیں۔ ہم اس سودے کا بیعانہ تک بھی ادا نہیں کر سکے۔ اس لیے میں آپ احباب سے درخواست کروں گا کہ آپ اس باب میں مزید ہمت کیجیئے۔ انسانی تاریخ میں یہ وقت بڑا نازک آیا ہے۔ قدیم تصوراتِ حیات اور نظام ہائے زندگی کا دور ختم ہو رہا ہے۔ ملوکیت، سرمایہ داری، مذہب، سب ایک ایک کر کے اُٹھتے اور مٹتے جا رہے ہیں۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں:۔

زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا!
تماشا دکھا کر مداری گیا!

اس وقت لَا کی طوفانی قوتیں (کمیونزم وغیرہ) بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ اگر اِلَّا اللہ کا تصور اس وقت سامنے نہ لایا گیا تو انہیں، اس کے بعد، ان کے مقام سے ہٹانے یا الا اللہ تک لانے میں، نہ معلوم کتنا وقت لگ جائے اور انسانیت کو کتنا عرصہ اس جہنم میں گزارنا پڑے جس میں وہ صدیوں سے بڑی جھلس رہی ہیں۔

اس لیے برادرانِ قدر! وقت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنی کوششوں کو تیز تر کر دیجیے اور قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لیے پہلے سے بھی زیادہ جوش و انہماک کے ساتھ مصروفِ عمل ہو جائیے۔

طلوعِ اسلام کی آٹھویں سالانہ کنونشن ۱۳ تا ۱۵ نومبر ۱۹۶۴ء کو گلبرگ لاہور میں منعقد ہوئی۔ محترم پرویز صاحب نے اراکینِ بزمہائے طلوعِ اسلام سے "حرفِ دلنواز" کے عنوان سے خطاب فرمایا۔ مفکرِ قرآن کے اس "حرفِ دلنواز" میں حیاتِ اجتماعیہ کے بڑے اہم اور بنیادی حقائق مضمر تھے۔ یہ شاید ان کا پہلا خطاب تھا جس میں دعوتِ قرآنی کے علمبرداروں کو ان نازک ترین گوشوں سے باخبر کیا گیا ہے جو کہ ہر ابھرتی ہوئی تحریک کے لیے ابتلاء و آزمائش کا سامان بنتے ہیں۔ یوں تو پرویز صاحب زندگی کی ہر حقیقت کا سراغ قرآن کی بارگاہ سے لاتے ہیں لیکن اس خطاب کا تو خصوصی امتیاز ہی یہی تھا کہ انھوں نے قرآن ہی کی زبان میں اس ذہنیت کی پوری تفصیل رفقائے سفر کے سامنے رکھ دی جو ہمدردی، دوستی، رفاقت اور تعاون کے نام پر ہر تحریک کے مستقبل کو زیر و زبر کرنے کے درپے رہتی ہے۔ جو ذاتی مقاصد کی بجا آوری کے لیے ہر تحریک میں ہراول دستہ بن کر شریک ہوتی ہے۔ اور انہی مقاصد کے پیشِ نظر تحریک کو خطرے میں ڈال کر رخصت ہو جاتی ہے۔ موصوف نے کہا کہ قرآنی نظام کی انقلابی تحریک کے داعیوں کو اس قسم کے خطرات سے محتاط رہنے کی ازبس ضرورت ہے۔

قرآنی دعوتِ انقلاب کا تجزیہ کرتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے فرمایا۔

"قرآنی دعوتِ انقلاب کے سلسلہ میں ایک بات اور بھی سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ اس دعوت پر سب سے پہلے غریبوں کی جماعت لبیک کہتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم اس دعوت کی سب سے پہلی آواز کو سامنے لاتے ہی اس حقیقت کو نمایاں طور پر سامنے لایا ہے جب حضرت نوحؑ نے قوم کے دولت مند طبقہ کے سامنے اس دعوت کو پیش کیا تو انھوں نے اعتراض ہی یہ کیا کہ ہم تمہاری جماعت میں کس طرح شامل ہو جائیں جبکہ حالت یہ ہے کہ: وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا۔ اس جماعت میں جو لوگ شامل

ہوتے ہیں۔ وہ ہمارے معاشرہ کے نہایت ادنےٰ درجے کے کمین لوگ ہیں۔ بَادِیَ الرَّاْیِ۔
ان کی شکل وصورت سے ظاہر ہے کہ وہ کس حیثیت کے مالک اور کس عقل وفکر کے حامل
ہیں۔ وَ مَا نَرٰی لَکُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ (۱۱/۲۷) کچھ اونچے لوگوں کی جماعت ہوتی تو ہم
اس میں شامل بھی ہو جاتے۔ آپ ان لوگوں کو جماعت سے نکال دیں، پھر ہم اس میں شامل ہو
جائیں گے۔ ان لوگوں سے آپ کو کیا ملے گا؟ — ان کے اس مطالبہ اور اعتراض کے جواب
میں حضرت نوحؑ نے جو کچھ کہا، وہ غور سے سننے کے قابل ہے۔ آپؑ نے فرمایا:
وَ مَا عِلْمِیْ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔ مجھے کچھ علم نہیں کہ یہ لوگ کیا کام کرتے ہیں؟ نہ ہی
مجھے ایسا کچھ معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے تو اتنا ہی معلوم ہے کہ یہ قلبِ سلیم لے کر حاضر ہوئے
ہیں اور میزانِ خداوندی میں وزن مال و دولت کا نہیں، قلب ونگاہ کا ہوتا ہے۔ تمہاری نگاہ
اپنی دولت و وجاہت پہ ہے اور خدا تعالیٰ کی نگاہ ان کے حسن خلوص اور حسنِ نیت پر۔........
اس لیے تمہارے مال و دولت تمہیں مبارک، میرے لیے یہی مفلس و نادار دنیا کی سب سے
بڑی متاع ہیں — اور یہی وہ شکایت تھی جو سرداران قریش کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف
تھی۔ یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے، آسمانی انقلاب کے ہر داعی کی توجہ
سورہ عبس کے تمثیلی انداز میں منعطف کرائی ہے...... لہٰذا برادرانِ عزیز! آپ کی حقیقی متاع
یہی غریب نادار بے رنیق ہیں...... جن کے سینے میں ایسا گرم دل ہے جس کی حرارت، موم کے
بنے ہوئے بڑے بڑے مہیب "خداؤں" کو پگھلا کر رکھ دیتی ہے...... لہٰذا
میرے عزیز بھائیو! لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْکَ اِلٰی مَا مَتَّعْنَا بِہٖ (۱۵/۸۸) تم ان مفاد
پرستوں کے مال و دولت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو۔ اور اپنی توجہ اپنے ان نادار لیکن
مخلص رفیقوں پر مرکوز کرو، جو آپ کی حقیقی متاع ہیں........ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ مال و
دولت والوں میں مخلص اور وفا شعار ہوتے ہی نہیں۔ اور نہ ہی یہ کہ آپ کی تحریک کو آگے
بڑھنے کے لیے روپے پیسے کی ضرورت نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دل کی صداقت
اور خلوص کی بناء پر نہیں، بلکہ محض مالی امداد کے سہارے تحریک میں نمایاں مقام حاصل کرنے
کے لیے شامل ہوئے وہ تحریک کے لیے ہمیشہ نقصان کا موجب ہوں گے۔ آپ کی تحریک
میں معیار فضیلت تقوےٰ ہونا چاہیے۔ یعنی خلوصِ قلب کے ساتھ فرائضِ منصبی کی
ادائیگی۔ نہ کہ مال و دولت اور جاہ و حشمت۔ آپ یہ نہ دیکھئے کہ کس کے پاس کیا ہے۔ یہ

دیکھئے کہ وہ خود کیا ہے۔ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۴۶/۱۹ ۔ آپ کا بنیادی معیار ہونا چاہیے۔

تحریک طلوع اسلام کا مقصد بیان کرتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے فرمایا:

"آپ کی تحریک کا مقصد ہی یہی ہے کہ قرآنی تعلیم کی رو سے آپ کے اندر تبدیلی کسقدر پیدا ہوئی ہے۔ اس کے لیے آپ کے ہاں عزت اور فضیلت ماپنے کا معیار ہی "تبدیلی" ہونا چاہیے۔ نہ کہ خارجی مفروضات ۔ نے اس مرتبہ کھلے اجلاس میں اپنے ایک خطاب کا موضوع رکھا ہے کہ "مومن کسے کہتے ہیں"۔ آپ اسے بغور دیکھئے اور پھر اس کی روشنی میں اپنا محاسبہ کرتے رہیئے کہ آپ کے اندر کس قدر تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ اگر آپ کے اندر قرآنی زاویۂ نگاہ سے تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تو پھر، میرے عزیز دوستو! نہ آپ کو قرآنی فکر کا سمجھنا کچھ فائدہ دے سکتا ہے اور نہ اس تحریک کے ساتھ وابستگی کچھ مفید ہو سکتی ہے۔ اور جب میں "آپ" کہتا ہوں تو اس کے اندر اپنے آپ کو پہلے شامل کرتا ہوں۔ اس داخلی تبدیلی کے بغیر آپ کے اجتماعات، تقاریب، آپ کے درس اور تقاریر، کھیل تماشہ سے زیادہ کچھ نہیں۔۔۔۔

محترم پرویز صاحب نے اپنے اس خطاب کے آخر میں قرآنی احباب سے اپیل کی کہ وہ وقت کے تقاضوں پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھیں۔ دنیا اپنے مختلف تجاذب میں ناکامی کے بعد سر راہ مایوس کھڑی ہے۔ قرآن کے باب عالی کے سوا اس کی نجات و سعادت کی کوئی اور راہ نہیں۔ اس لیے اٹھئے اور اپنی رفتار کو تیز تر کر دیجیے اور نوع انسانی کو یہ بتائیے کہ اس کی مشکلات کا حل قرآن کی بارگاہ کے سوا اور کہیں سے نہیں مل سکتا۔

طلوع اسلام کی نویں سالانہ کنونشن ۱۷ تا ۲۰ مارچ ۱۹۶۶ء کو گلبرگ لاہور میں منعقد ہوئی۔ اراکین بزم ہائے طلوع اسلام سے محترم پرویز صاحب نے جو خطاب فرمایا۔ اس کا عنوان تھا۔۔۔۔ "آپ آگئے تو رونق کاشانہ ہو گئی"۔ اس خطاب میں موصوف نے بیتابی تمنا اور صبر طلبی عشق کی کشمکش کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے فرمایا:

یاد رکھیے! ہمارا طریق کار ہنگامہ آرائی اور تماشہ گری نہیں۔ ہمارا طریق نہایت خاموش اور پُرامن طور پر قرآنی فکر کو عام کیئے جانا ہے۔ تاکہ اس نظام کے قیام کا تقاضا لوگوں کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے۔ ہم میں سے بعض تیز طبائع پر اس طریق کار کی سست روی بعض اوقات گراں گزرتی ہے۔ وہ عام سیاسی جماعتوں کے سے ہنگامہ آرائی کے پروگرام اختیار کرنے کی تجویز کرتے ہیں۔ ان کی خدمت میں گذارش ہے کہ ہمارا یہ طریق کار، قرآنی فکر،

تاریخی شواہد اور انسانی نفسیات کے گہرے مطالعہ پر مبنی ہے۔ جو احباب ہمارے ہم سفر ہونا چاہیں انھیں یہ سب کچھ سوچ سمجھ کر شریک ہونا چاہیے۔ یہ کوہ کنی بڑی صبر آزما ہے۔ یہ قرآن کریم کے الفاظ میں پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنے کے مترادف ہے جس میں قدم قدم ہی چلا جاسکتا ہے ورنہ .... سانس اکھڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے ....

اس قسم کی بیتابیٔ تمنا کا مظاہرہ بعض ایسے افراد کی طرف سے ہوتا ہے جو تقاضا کرتے رہتے ہیں کہ اب ہمیں کچھ اور پروگرام بھی ملنا چاہیئے۔ میں ایسے احباب سے باادب پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ اپنے موجودہ پروگرام کو بخیر و خوبی مکمل کر چکے ہیں جو اس کی اگلی کڑی کا تقاضا شروع کر دیا ہے؟ آپ کا موجودہ پروگرام یہ ہے کہ قرآنی فکر کو ملک میں اس طرح عام کیا جائے کہ قرآنی نظام کے قیام کا تقاضا آپ کی اپنی جماعت ہی کا نہیں پوری ملتِ پاکستانیہ کا قلبی تقاضا بن جائے۔ ذرا سوچیئے کہ کیا یہ کچھ ہم کر چکے ہیں؟ کیا اس فکر کی اشاعت ملک بھر ہو چکی ہے؟ کیا آپ اسے ہر کان تک پہنچا چکے ہیں۔ اور اسے ہر دل میں اتارنے کا فریضہ ادا کر چکے ہیں؟ جب آپ اس فریضہ سے فارغ ہو جائیں گے تو پھر اس پروگرام کی اگلی کڑی کا مطالبہ کیجیئے گا اس وقت اگلی کڑی کا مطالبہ قبل از وقت ہے۔

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی نجاتِ دیدۂ و دل کی گھڑی نہیں آئی
بڑھے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

طلوع اسلام کی دسویں سالانہ کنونشن ۔ ۹ تا ۱۲ نومبر ۱۹۶۷ء کو گلبرگ لاہور میں منعقد ہوئی اس میں محترم پرویز صاحب کے خطاب کا عنوان تھا "نوائے صبحگاہی" اس خطاب میں محترم موصوف نے احتساب خویش کی طرف خصوصی طور پر توجہ دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

یاد رکھیئے! قرآن کریم کا حقیقی مقصد، انسان کی سیرت و کردار میں خوشگوار تبدیلی پیدا کرنا ہے اور یہ مقصد حاصل ہو نہیں سکتا، جب تک قرآنی فکر انسان کے قلب کی گہرائیوں تک نہ اترے۔ ..... اس بات کو پرکھنے کا معیار (کہ کس کی شخصیت کس حد تک متوازن ہو چکی ہے، یہ ہے کہ اس میں (علیٰ حدِ بشریت) صفاتِ خداوندی کا انعکاس کس حد تک ہوتا ہے۔ اسی کو خدا کے رنگ میں رنگے جانا کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں صفاتِ خداوندی (الاسماء الحُسنیٰ) کا تذکرہ اس اصرار و تکرار کے ساتھ آیا ہی اس لیے ہے کہ وہ ہماری سیرت کے پرکھنے کا نہایت واضح خارجی معیار بن سکیں۔

تحریکِ طلوعِ اسلام کے کارکنوں کی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے کہا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ملک میں خالص فکری تحریک آپ کی ہے، باقی سب وقتی ہنگامہ آرائی ہے۔ جس میں اسلام کا نام اس طرح لیا جاتا ہے، جیسے خطوں کی پیشانی پر (۷۸۶) لکھ دیا جاتا ہے۔ کہ اسے نفسِ مضمون سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ یا اسے اپنی مفاد پرستیوں کے لیے بطور سپر استعمال کیا جاتا ہے۔ سلطانی ہو یا درویشی، اسلام کو ہر جگہ EXPLOIT کیا جاتا ہے۔ اس کے درد کا مداوا کوئی نہیں سوچتا۔ حقیقت یہ ہے کہ

کسی کو رنگ سے مطلب کسی کو خوشبو سے — گلوں کے چاکِ گریباں کی بات کون کرے۔

یہ بات آپ ہی کرتے ہیں۔ اور آپ کا پروگرام یہی ہے کہ آپ گلوں کے رنگ اور خوشبو سے بے نیاز ہو کر، ان کے چاکِ گریبان کی بات کیے جائیں۔ اگر آپ نے اپنی کوششوں کو اسی طرح جاری رکھا تو آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ یہ زمین کس طرح اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھتی ہے۔ ...... باقی رہی اس فکر کی مخالفت۔ سو میرے عزیزو! میرے رفیقو! میرے ہم سفرو! قرآنی فکر و نظام کے خلاف یہ یورشیں چند روزہ ہیں آپ اسی طرح ہمت کیے جائیے، یہ ریت کے ذروں کی طرح منتشر ہو جائیں گی .... آپ اس حقیقت پر یقین رکھئے کہ

رات کے ماتھے پہ افسردہ ستاروں کا ہجوم — صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے۔

راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے آگاہ کرتے ہوئے مفکرِ قرآن نے کہا:۔

لیکن عزیزانِ من! اس سفر میں ایک گھاٹی ایسی بھی آتی ہے۔ جہاں کوئی باہر کا رہزن، ڈاکہ زنی نہیں کرتا۔ خود اپنے اندر کا چور کمین میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔ یہ گھاٹی ایسی ہے جہاں سے پاؤں پھسلے تو انسان سیدھا جہنم کے عمیق غاروں میں جا گرتا ہے اور وہ گھاٹی یہ ہے کہ آپ اس سلسلے میں جو کچھ کریں اس میں کسی دنیاوی اجر و معاوضہ کا خیال تو ایک طرف، نمود و نمائش کا شائبہ تک بھی نہ آنے پائے، کہ یہ وہ شرک کی چنگاری ہے جو سب متاعِ عمل کو جلا کر خاکستر بنا دیتی ہے۔ قرآن کریم نے اس عظیم حقیقت کو بڑے بصیرت افروز انداز سے بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ۔ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۱۷/۷۔ تم کوئی اچھا کام کرتے ہو تو وہ کسی دوسرے کے لیے نہیں، بلکہ خود تمہاری بھلائی کے لیے ہوتا ہے۔ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ (۲/۲۷۲) جو کچھ تم بظاہر دوسروں کو دیتے ہو وہ درحقیقت خود اپنے آپ کو دیتے ہو۔ اب آپ سوچئے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم ایک مکان اپنے لیے بناؤ اور اس کا احسان اہل مکہ کے سر دھرو۔ تم کھانا خود کھاؤ اور

باقی صـ ۲۹ پر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خُدا کی گرفت

یہ مضمون ۱۹۷۷ء کے حالات کی مناسبت سے لکھا گیا تھا۔ مضمون کی افادیت کے پیشِ نظر اسے بلاترمیم، بارِ دگر شائع کیا جاتا ہے

آجکل یہ فقرہ زبان زدِ خلائق ہے کہ پاکستان کے لئے ۱۹۷۷ء (کا سال) بڑا منحوس ثابت ہوا ہے۔ ہم تو "سعد و نحس" کے قائل نہیں۔ اس لئے کہ قرآنِ کریم نے ان لوگوں سے، جو سمجھتے تھے کہ نحوست کہیں خارج سے آتی ہے، واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ: طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ۔ (۳۶/۱۹) نحوست کہیں باہر سے نہیں آیا کرتی۔ وہ تو تمہارے ساتھ چپکی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ: مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ۔ (۴۲/۳۰) جو مصیبت بھی تم پر آتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ تمہارے اپنے اعمال ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ کہیں خارج سے تم پر وارد نہیں ہو جاتی۔ لہٰذا ہم نہ تو "گردشِ افلاک" کو مطعون کر سکتے ہیں، نہ "قسمت کے لکھے" کی خود فریبی سے، اپنی خطا کوششوں کے نتائج کو اربابِ قضا و قدر کے سر تھوپ کر، بری الذمہ ہو سکتے۔ لیکن اگر "نحوست" کی توہم پرستی سے الگ ہٹ کر دیکھا جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ جس قسم کی پریشانیوں میں ملک اس سال گرفتار ہوا ہے اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ امسال شروع جنوری میں، مارچ میں انتخابات منعقد کرنے کا فیصلہ اور اعلان ہوا تو ملک میں انتخابی سرگرمیوں کے جھکڑ چلنے شروع ہو گئے۔ خدا خدا کر کے انتخابات منعقد ہوئے تو انتخابات میں بدعنوانیوں کے الزامات کے سلسلہ میں ہنگامی تحریک شروع ہو گئی جس سے سارا ملک فسادات کی شعلہ باریوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ قریب چار ماہ تک ملک گیر تباہیوں اور بربادیوں کا یہ جنون عام رہا تو (۵) جولائی کو مارشل لاء لگ گیا۔ (۱۸) اکتوبر نئے انتخابات کی تاریخ مقرر ہوئی۔ عید کے فوری بعد (۱۷ ستمبر سے) انتخابی سرگرمیوں کی اجازت ملی۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد (شروع اکتوبر میں) انتخابات غیر معینہ مدت تک کے لئے ملتوی کر دینے کا اعلان ہو گیا۔ اس وقت، مسٹر بھٹو، اور ان کی (پیپلز) پارٹی کے (سابقہ) برسرِ اقتدار ذمہ دار، افراد میں سے بعض کے خلاف۔ عدالتوں میں مقدمات دائر ہیں۔ اکثر کے خلاف تحقیق و تفتیش کا عمل جاری ہے۔ چونکہ مستقبل کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا اس لئے سارا ملک عجیب قسم کی سراسیمگی اور حزن کی گرفت میں آیا ہوا ہے ——— وہ حزن جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وجہ کچھ معلوم نہیں ——— مگر دل

ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے۔ کسی زمانے میں اسے محض شاعرانہ یاس انگیزی سے تعبیر کیا کرتے تھے جو کہتا تھا کہ: ؎

ہے کوئی بات آج ہونے کو جی بہت چاہتا ہے رونے کو

آج یہ "شاعری" حقیقت بن کر سامنے آ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس خطۂ پاک کو ہر طرح کے خارجی اور داخلی خطرات سے محفوظ رکھے، کہ اس کی حفاظت کے ساتھ ہماری ہر متاعِ حیات کی حفاظت وابستہ ہے۔

ہماری قوم بڑی جذباتی واقعہ ہوئی ہے۔ جذباتی قوم جب اس قسم کے غیر معمولی حادثات سے دوچار ہو جو ان دنوں یہاں رونما ہوئے ہیں تو وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتی ہے، حالانکہ ایسے حالات میں ہوش و حواس کو اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ برقرار رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس حواس باختگی کا پہلا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غلط اور صحیح میں امتیاز اٹھ جاتا ہے۔ اس کی ایک نمایاں مثال پر غور کیجئے۔ قرآن کریم نے تلقین اور تاکید کی ہے کہ اگر کسی کے خلاف کوئی الزام عائد ہو تو ملزم کے متعلق حسنِ ظن سے کام لو۔ اور جب تک وہ الزام ثابت نہ ہو جائے اسے مجرم نہ تصور کرو۔ اس نے الزام اور جرم یا ملزم اور مجرم میں اس فرق پر اس قدر زور دیا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ جب کسی کے خلاف کوئی الزام عائد ہو تو تمہارا پہلا ردِ عمل یہ ہونا چاہیئے کہ:

هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ (۲۴/۱۲) وَهٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ (۲۴/۱۶)

ہو سکتا ہے کہ یہ الزام جھوٹا ہو، یونہی بہتان ہو۔ اس کے برعکس وہ کہتا ہے کہ تمہاری حالت یہ ہے کہ جونہی کوئی بات سنی اسے لے اڑے۔ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ بِهٖ عِلْمٌ۔ اور بلا علم و تحقیق افواہیں پھیلانی شروع کر دیں۔ وہ کہتا ہے کہ: تَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا۔ تم اسے معمولی بات سمجھتے ہو۔ اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ وَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ (۲۴/۱۵) حالانکہ عدالتِ خداوندی میں یہ بڑا سنگین جرم ہے۔ ملزم کو مجرم مشہور کر دینے سے، اس شخص کو کس قدر نقصان پہنچتا ہے، قطع نظر اس کے اس قسم کے معاشرہ کے متعلق کیا تاثر عام ہوتا ہے اس پر غور فرمایئے۔ پچھلے دنوں، الزامات کو جرائم قرار دے کر ان کے متعلق جس شدت اور وسعت سے شور مچایا گیا اس سے بیرونی ممالک میں یہ تاثر پیدا ہو رہا ہے گویا یہ ساری قوم مجرموں سے پٹی پڑی ہے۔ لوگوں نے اتنا بھی ضبط نہیں کیا کہ جو مقدمات عدالتوں میں زیرِ سماعت ہیں، ان کے متعلق عدالتوں کے فیصلہ کا تو انتظار کر لیا جائے اور اس کے بعد مجرم اسے سمجھا جائے جسے عدالت مجرم قرار دیدے۔ ملک کے رائج الوقت قانون کی رو سے بھی زیرِ سماعت مقدمات کے متعلق رائے زنی کرنا ممنوع ہے۔ لیکن یہاں اس قانون کی بھی پرواہ نہ کی گئی۔ اس کے برعکس، یہاں اس قسم کے افسانے تراشے گئے کہ الامان و الحفیظ۔ اور پھر افسانے تراشنے والے انہیں اس حتم و یقین کے ساتھ بیان کرتے تھے گویا یہ اس جرم کے ارتکاب کے عینی شاہد ہوں۔ یہ کچھ، افراد تک محدود نہیں رہا۔ اخبارات ان سے بھی دس قدم آگے بڑھ گئے ــــ ایسا نظر آتا تھا گویا ان اخباروں نے باہمی ریس (RACE) لگا رکھی ہے کہ کون زیادہ "سنسنی خیز" افسانے چھاپتا ہے۔ جس طرح چورن بیچنے والے کی بکری کا راز اس میں ہوتا ہے کہ وہ کتنے تیز اور زیادہ مسالے ڈالتا ہے، اس طرح ان اخباروں کی کمائی کا راز اس میں تھا کہ کون زیادہ کیچڑ اچھالتا ہے۔ معاشرہ اس قسم کی "ہولی" کھیلنے میں مصروف تھا اور ہم انگشت بدنداں کہ

بارِ الٰہا! کیا یہ وہی قوم ہے جس نے ابھی ابھی پورا مہینہ قرآن سنا، اور ایک ایک رات میں اسے ختم کیا ہے؛ کیا قرآن پڑھنے اور سننے والی قوم کا کردار ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ تیرے جس رسول کے پاک نام (صلے اللہ علیہ وسلم) پر یہ اپنا نظام قائم کرنے کی مدعی ہے، کیا اس رسولؐ نے انہیں یہی تعلیم دی تھی!

قرآن مجید اور حضور نبی اکرمؐ کی تعلیم یہ ہے کہ جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے ملزم کو بے گناہ سمجھا جائے۔ اور جرم ثابت ہو جانے پر قانون کے مطابق سزا دی جائے۔ الزامات کی کبھی تشہیر نہ کی جائے۔ ان کے جرم ثابت ہونے کا انتظار کیا جائے۔

کہا یہ جاتا ہے کہ یہ غنیمت ہوا کہ ملک میں مارشل لا لگ گیا اور مجرمین گرفت میں آ گئے۔ ایسا نہ ہوتا تو انہیں کون پوچھ سکتا تھا؛ یہ اسی طرح دندناتے پھرتے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مجرمین کو کیفرِ کردار تک پہنچانا ایک عادل حکومت کا فریضہ ہے۔ اور اگر کوئی حکومت اپنے اس فریضہ کو ادا کرتی ہے تو وہ مستحق تبریک و تحسین ہے۔ لیکن جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں انہیں یہ نہیں سمجھنا اور کہنا چاہیئے کہ اگر مجرم انسانی احتساب کی گرفت میں نہ آئیں، تو انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ خدا کو ماننے والوں کا ایمان یہ ہوتا ہے کہ مجرم انسانی احتساب کی گرفت میں آئیں یا نہ آئیں، اس احتساب کے اوپر ایک اور نظامِ احتساب ہے جس کی گرفت سے کوئی مجرم بچ نہیں سکتا۔

اسے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ یہ ہماری وہ فراموش کردہ حقیقت ہے جس کی ہم یاددہانی نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ جو ہمارے ہاں (بلکہ دنیا میں) جرائم عام ہو رہے ہیں، اسی حقیقت کی فراموشی کا نتیجہ ہے۔

دین کا سارا نظام، قانونِ مکافاتِ عمل کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ سارا نظامِ کائنات ہی اسی محور کے گرد گردش کرتا ہے۔ قانونِ مکافاتِ عمل کے معنی یہ ہیں کہ:-

(۱) خدا نے ہر کام کا ایک نتیجہ مقرر کر رکھا ہے جو ہر حال میں برآمد ہو کر رہتا ہے۔ نظامِ کائنات میں اسے سلسلۂ علت و معلول (LAW OF CAUSE & EFFECT) کہا جاتا ہے۔

(۲) جو قانون خارجی کائنات میں کارفرما ہے، وہی انسانی دنیا میں نافذالعمل ہے۔ یعنی انسان کا کوئی عمل (کام) بھی نتیجہ مرتب کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ غلط کام کا نتیجہ تباہ کن (جسے عام طور پر سزا کہا جاتا ہے) اور صحیح کام کا نتیجہ منفعت بخش (جسے جزا کہہ کر پکارا جاتا ہے) صحیح اور غلط کا معیار بھی خود خدا کا مقرر کردہ ہے۔

خارجی کائنات میں، قانونِ مکافات کی کارفرمائی کے متعلق نہ کسی کو کوئی شک و شبہ ہو سکتا ہے۔ نہ کسی قسم کا اعتراض۔ سائنس کا سارا مدار اسی قانون پر ہے، اور ہر سائنٹیفک عمل کا نتیجہ اس قانون کی زندہ شہادت۔ لیکن انسانی دنیا میں دو قسم کے نظریات پائے جاتے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ انسانی دنیا میں صرف سوسائٹی کے قوانین کارفرما ہوتے ہیں۔ ان سے بالا (یا علاوہ) کوئی اور قانون نہیں۔ اس نظریہ کی رو سے سوسائٹی (یا حکومت) تمدنی

زندگی کے لئے کچھ قواعد و ضوابط وضع کرتی ہے۔ جو کام ان ضوابط کے مطابق کئے جائیں، انہیں صحیح کہا جاتا ہے۔ جو ان کے خلاف ہوں انہیں غلط (یا جرائم) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ جرائم کی پاداش کے لئے سوسائٹی نے ایک نظامِ احتساب و مواخذہ مقرر کر رکھا ہے۔ جو مجرم اس احتساب کی گرفت میں آ جاتا ہے اسے اس کے کئے کی سزا مل جاتی ہے۔

لیکن یہ نظامِ احتساب و مؤاخذہ اور عدل و انصاف اس قدر ناقص ہے کہ مجرمین اس کی گرفت سے بچنے، یا گرفت میں آ جانے کے بعد جرم کی پاداش سے محفوظ رہنے کے لئے طرح طرح کی تدابیر وضع اور اختیار کر لیتے ہیں۔ دوسری طرف کئی بے گناہ مفت میں سزائیں بھگتتے ہیں۔

یہ جو دنیا میں جرائم اس قدر عام ہو رہے ہیں اور دھاندلیوں کی بھی کوئی حد نہیں تو وہ نظامِ احتساب و عدل کے اسی نقص کا نتیجہ ہے۔ انسانی سوسائٹی آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکی جو ان نقائص سے مبرا ہو۔

اس نظریہ کو (قرآن کریم کی روشنی میں) الحاد۔ بے دینی۔ کفر۔ انکارِ خدا۔ دہریت۔ مادہ پرستی۔ سیکولرازم۔ کمیونزم۔ سوشلزم وغیرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں (عملاً) یہی نظریہ کارفرما ہے۔ ان قوموں میں بھی جو خدا کا کھلے بندوں انکار کرتی ہیں، اور ان میں بھی جو زبان سے اس پر ایمان کی معترف ہیں لیکن عملاً اس سے انکاری ہیں۔ انہی میں (ہم) مسلمانوں کی قوم بھی شامل ہے۔ ہم میں بھی جو جرائم اس قدر عام ہو رہے ہیں اس کی وجہ یہی ہے۔

اس کے برعکس، ایک نظریہ اللہ تعالیٰ نے (قرآن مجید) میں دیا ہے۔ اس نظریہ کا ملخص یہ ہے کہ اس کا سوال ہی نہیں کہ سوسائٹی کا کوئی نظامِ احتساب و عدل ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو وہ کارفرما ہے یا معطل ہے۔ کوئی اس کی گرفت میں آتا ہے یا اس سے بچ جاتا ہے ـــ خدا نے اپنا نظامِ احتساب و عدل مقرر کر رکھا ہے جس کی کیفیت یہ ہے کہ کسی انسان کا کوئی عمل (کام) نہ اس کی نگاہ سے اوجھل رہ سکتا ہے، نہ گرفت سے باہر، اور نہ ہی بلا نتیجہ۔ وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللَّهُ۔ (۲/۲۸۴)

جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، وہ ارادہ کی شکل میں دل میں رہے، یا عمل کی صورت اختیار کر کے نمودار ہو جائے۔ وہ نظامِ خداوندی کے محاسبہ سے نہیں بچ سکتا۔ یہ نظامِ احتساب و عدل کیا ہے اور کس طرح کارفرما ہے اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن خدا نے یہ بتایا ہے کہ ساری کارگہِ کائنات اس مقصد کے حصول کے لئے مصروف ہے۔ فرمایا:-

وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۔ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ أَسَاءُوا بِمَا عَمِلُوا وَيَجْزِيَ الَّذِينَ أَحْسَنُوا بِالْحُسْنَى ۔ (۵۳/۳۱)

یہ تمام سلسلۂ کائنات خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرمِ عمل ہے۔ اور وہ پروگرام یہ ہے کہ غلط کام کرنے والوں کو ان کے جرائم کی سزا ملے اور اچھے کام کرنے والوں کو اُن کے حسنِ عمل کا خوشگوار صلہ ملے۔

اس نظام کی جزرسی اور باریک بینی کا یہ عالم ہے کہ:-

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۔ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ

شَرًّا يَّرَهٗ۔ (۹۹/۷-۸)

صحیح اور غلط کاموں کے ایک ایک ذرّہ کا نتیجہ سامنے آجائے گا۔

کوئی مجرم اس کی گرفت میں آکر چھوٹ نہیں سکے گا کہ:۔

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ۔ (۸۵/۱۲) تیرے رب کے قانونِ احتساب کی گرفت بڑی سخت ہے۔

اس کے بعد اس کے نظامِ عدل کی یہ کیفیت ہے کہ:۔

لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۔ (۲/۴۸)

اس میں نہ کوئی شخص کسی دوسرے کے بدلے سزا پائے گا اور نہ کوئی، کسی مجرم کا ذرا سا بوجھ بٹا سکے گا۔ ہر ایک اپنے کئے کی سزا خود بھگتے گا۔ نہ ہی کسی کی سفارش کسی کے کام آسکے گی۔ نہ کوئی کچھ دے دلا کر سزا سے بچ سکے گا۔ نہ ہی کسی کو اس کی مجال ہوگی کہ وہ مجرم کی مدد کو پہنچ سکے۔

اس طرح لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ (۲/۲۸۶) ہر شخص کو اس کے اچھے کام کی جزا اور غلط کام کی سزا مل کر رہے گی۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔ (۶/۱۶۵) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ۔ (۱۶/۳۳) کسی پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہیں ہوگی۔

یہ ہے نظامِ احتساب و عدل کا دوسرا نظریہ۔ خدا پر ایمان لانے سے (عملاً) مراد ہے اِس نظام کی صداقت پر یقین رکھنا۔ آپ سوچئے کہ اس نظریہ یا نظام پر ایمان رکھنے والوں سے کبھی کوئی جرم سرزد ہو سکتا ہے؟ اگر سہو و خطا سے کبھی ایسا ہو جائے تو وہ (قانون میں رکھی گئی گنجائش کے مطابق) اس کی تلافی کی فوراً کوشش کریں گے۔ اسے اصطلاح میں توبہ کہتے ہیں۔ (یعنی اپنی خطاکاری پر ندامت، آئندہ کے لئے اس سے مجتنب رہنے کی یقین دہانی، اور زیادہ سے زیادہ حسنِ عمل سے اس نقصان کے ازالہ کی کوشش جو اس لغزش سے واقعہ ہو گیا تھا)۔

معاشرہ کے وہ ملزم جن کی اس وقت گرفت ہو رہی ہے اگر وہ واقعی مجرم ہیں تو وہ درحقیقت خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی گرفت میں آرہے ہیں۔ ہم تو محرمانِ رازِ درونِ خانہ میں سے نہیں تھے اس لئے ہمیں پسِ پردہ بدعنوانیوں کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن ان میں سے جو غلط کاری کبھی اُبھر کر سامنے آجاتی تھی تو ہم اس پر ان اربابِ حل و عقد کو متنبہ کرتے اور خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی یاددہانی کراتے تھے۔ لیکن اس قسم کی یاددہانی کا فائدہ تو اسے ہی ہو سکتا ہے جس کا اس قانون پر ایمان ہو ــــ اور جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، آج اس قانون پر (بجز مستثنیات) شاید ہی کسی کا ایمان ہو۔ اگر اس پر ایمان ہو تو یہ دنیا جنت بن جائے۔

اس نظریہ (یا قانون) کے خلاف اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ظالم، ظلم کئے چلا جاتا ہے۔

اور مظلوم تڑپ کر مر جاتے ہیں، لیکن اس ظالم کی کلائی نہیں مروڑی جاتی۔ اسے کوئی سزا نہیں ملتی۔ وہ بلکہ اور پنپتا چلا جاتا ہے۔ اس کی وجہ (خود اللہ تعالیٰ نے) یہ بتائی ہے کہ عمل اور اس کے نتیجہ میں مہلت کا وقفہ ہوتا ہے جس سے مقصد، غلط کاروں کو اصلاح کا موقعہ دینا ہوتا ہے۔ اگر ان کا نصیبہ یاوری کرے اور وہ اپنی اصلاح کر لیں تو ہُوَالمراد۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ کریں تو پھر ظہورِ نتائج کا وقت آجاتا ہے اور اس وقت نہ ان کا چیخنا چلانا ان کے کسی کام آسکتا ہے، اور نہ ہی کوئی اور ان کی مدد کر سکتا ہے۔ کسی اور کا ان کی مدد کے لئے آنا تو ایک طرف، اس وقت حالت یہ ہوتی ہے کہ: اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔ (۴۳/۶۷) اس وقت دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ قرآن ہی کے الفاظ ہیں۔ یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ۔ دوست، اپنے دوست سے، (آنکھ بچا کر) بھاگ جائے گا۔ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِیْهِ۔ ماں اور باپ تک کنارہ کش ہو جائیں گے وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِیْهِ۔ بیوی اور بچے سب آنکھیں بدل لیں گے۔ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْهِ۔ (۸۰/۳۴-۳۷) اس دن ہر ایک کو اپنی جان کی پڑی ہوگی اور ہر ایک اپنے بچاؤ کی فکر میں بدحواس ہوگا۔ اس دن سب سازشیں اور تدبیریں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔

یَوْمَ لَا یُغْنِیْ عَنْهُمْ كَیْدُهُمْ شَیْـًٔا وَّ لَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ (۵۲/۴۶)

یہ ہوتی ہے کیفیت اس وقت جب خدا کے نظامِ عدل و احتساب کا فولادی پنجہ، مجرمین کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ ہمارے ہاں ہوا یہ کہ ہماری مذہبی پیشوائیت نے خدا کے نظامِ عدل و احتساب' اور اس کی رو سے ملنے والی سزاؤں کو "قیامت" پر اٹھا دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ظالم، مستبد، سرکش مجرمین مطمئن ہوگئے کہ ہمیں دنیا میں پوچھنے والا کوئی نہیں۔ اور یوں وہ اپنے ظلم و ستم کی کارستانیوں میں اور دلیر ہوگئے۔ قیامت کی جزا و سزا برحق، اور اس پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں کہ خدا نے اپنے نظامِ عدل و احتساب کا دائرہ (JURISDICTION) اُخروی زندگی کو قرار دے رکھا ہے اور اس دنیا کو بے محابا چھوڑ دیا ہے کہ جس کا جو جی چاہے کرتا پھرے، اُسے کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ اس نے کہا ہے، اور واضح الفاظ میں کہا ہے کہ یہ دنیا اور اگلی دنیا دونوں اس کے (خدا کے) قانونِ مکافات کے حلقۂ اقتدار و نفوذ کے اندر ہیں۔ قرآنِ کریم کی متعدد آیات اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ مثلاً سورۃ التوبہ میں ہے کہ:۔

اِنْ یَّتَوَلَّوْا یُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِیْمًا فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ۔ (۹/۷۴)

اگر یہ لوگ اس سے روگردانی کریں گے تو اللہ انہیں دنیا اور آخرت دونوں میں الم انگیز سزا دیگا۔

اور سب سے بڑی سزا: خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا۔ (۲/۸۵) ہے۔ یعنی اس دنیا میں ذلت و رسوائی۔ یہ سزا انسانوں کے ہاتھوں ہی سے ملتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا:۔

قَاتِلُوْهُمْ یُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَیْدِیْكُمْ وَ یُخْزِهِمْ وَ یَنْصُرْكُمْ عَلَیْهِمْ (۹/۱۴)

جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ تم ان سرکشوں کے ساتھ جنگ کرو۔ اللہ انہیں تمہارے ہاتھوں سے سزا دلائے گا۔ انہیں ذلیل و رسوا کرے گا اور تمہیں ان پر غلبہ عطا کرے گا۔

واضح رہے کہ اس آیت میں تو یہ کہا گیا ہے کہ ان مجرمین کو ان کے جرائم کی سزا جماعتِ مومنین کے ہاتھوں ملے گی لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ سزا ہر حال میں انہی لوگوں کے ہاتھ سے ملے جو قوانینِ خداوندی کے پابند ہوں۔ ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ جب کسی ملک کی بدعنوان حکومت کی غلط کاریوں سے مملکت کمزور ہو جائے تو کوئی ایسی قوم اس پر چڑھ دوڑے جس کے پاس دنیاوی قوت ان سے زیادہ ہو۔

اور بعض اوقات، اس عذاب کی شکل وہ ہوتی ہے جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ - اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ - (۶/۶۵)

ان سے کہو کہ غلط نظام کی پیدا کردہ تباہی مختلف شکلوں میں آتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سوسائٹی کے اوپر کے طبقہ میں خرابیاں عام ہو جاتی ہیں اور ان کی وجہ سے معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ کبھی نیچے کے طبقہ میں لاقانونیت پھیل جاتی ہے تو وہ تباہی مچا دیتے ہیں۔ (۱۶/۴۵-۴۷)۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ دونوں طبقے (لیڈر اور عوام) مخلوط پارٹیوں میں بٹ جاتے ہیں اور خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے۔ اور ملک یوں تباہ ہو جاتا ہے۔

دیکھو ہم کس طرح اپنے قوانین کو پہلو بدلا بدلا کر سامنے لاتے ہیں تاکہ لوگ اچھی طرح بات سمجھ سکیں۔

بعض اوقات اس مقصد کے لئے خود ظالمین کی مختلف پارٹیاں ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتی ہیں۔

وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ - (۶/۱۳۰)

اس طرح خود ظالمین کا ایک گروہ دوسرے گروہ کا حلیف بن جاتا ہے۔ کیونکہ جو کچھ وہ کرتے ہیں وہ یک رنگ ہوتا ہے۔

یہ ہیں عذاب (سزاؤں اور تباہیوں) کی وہ شکلیں جن کے متعلق قرآن کریم نے (WARN) کیا کہ:

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً - (۸/۲۵)

اس فتنہ سے محتاط رہو کہ جب وہ آتا ہے تو صرف ظالمین تک محدود نہیں رہتا۔ وہ سارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتا ہے۔

اور یہاں سے ہماری سوچ کا رُخ ایک اور سمت کی طرف مڑ جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان جرائم کے مرتکب تو محض ظالمین، لیکن ان کے نتائج میں جو عذاب آیا، اس میں سارا معاشرہ مبتلا ہو گیا۔ انہوں نے کیا قصور کیا تھا جو یہ بھی اس تباہی کی لپیٹ میں آ گئے۔ قرآن مجید نے اس سوال کا جواب بڑے محاکاتی انداز میں دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جہنم میں لیڈر اور ان کے متبعین (FOLLOWERS)

یعنی عوام، یکجا مبتلائے عذاب ہونگے تو ان میں باہمی سخت جھگڑا ہوگا۔
وہ ایک دوسرے کو مطعون کریں گے۔ عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ تم یورشیں کرکے ہماری طرف آیا کرتے تھے اور اس طرح ہمیں غلط راستے پر ڈال دیتے تھے۔ وہ ان سے کہیں گے کہ ہمارا تم پر کیا اختیار اور اقتدار تھا۔ تم خود ہی صحیح راستے پر چلنا نہیں چاہتے تھے۔ (تم صحیح راستے پر چلنا چاہتے تو ہمارے پاس کونسی قوت تھی جس سے ہم تمہیں مجبور کرکے غلط راستے پر ڈال سکتے تھے) ہم غلط راستے پر چل رہے تھے۔ تم نے ہمارا اتباع شروع کر دیا اور اُسی راستے پر چل نکلے۔ اب اس عذاب میں ہم سب برابر کے شریک ہیں۔ (۳۳/۶۷-۶۸)

عوام کا یہ عذر کہ ہماری گمراہی کے ذمہ دار یہ لیڈر ہیں بارگاہِ خداوندی میں بھی قابلِ پذیرائی نہیں ہوگا۔ ان سے کہا جائے گا کہ ان لیڈروں کو اس قابل تم نے ہی تو بنایا تھا کہ وہ اس قسم کی بدعنوانیوں کے مرتکب ہوئے۔ اگر تم اقتدار ان کے سپرد نہ کرتے تو یہ ان زیادتیوں کے مرتکب کس طرح ہو سکتے تھے؟

آپ، ذرا اس حقیقت کو اپنے احوال و ظروف پر منطبق کرکے دیکھئے۔ اس وقت کم و بیش ساری قوم چلّا رہی ہے کہ سابقہ اربابِ اقتدار نے یہ زیادتی کی اور وہ زیادتی کی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ انہیں صاحبِ اقتدار بنایا کس نے تھا؟ خود ہم ہی نے۔ اگر ہم انہیں ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں کامیاب نہ کراتے، تو وہ اس قسم کی بدعنوانیاں کس طرح کر سکتے! ان کے پاس کوئی ذاتی قوت نہیں تھی۔ یہ ساری قوت خود ہماری تفویض کردہ تھی۔ بقول کسے:

تمہیں تو "تم" کے سوا، کوئی کچھ نہ کہتا تھا — جناب ہم نے بنایا، حضور ہم نے کیا

آپ کہیں گے کہ ہمیں کیا معلوم تھا کہ یہ اس قسم کے ہیں؟

اور یہی تو آپ کا بنیادی قصور ہے۔ یہی وہ سب سے بڑا جرم ہے جس کی پاداش میں آپ بھی اس عذاب میں مبتلا ہیں —— اور ہمارا، آپ کا، یہ جرم، یہ قصور، کچھ نیا نہیں۔ ہم شروع سے یہی کچھ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ آج قوم کی طرف سے مطالبات ہو رہے ہیں کہ اس ممبر کی انکوائری کرو، اس وزیر کی تحقیق کرو۔ اس چیف منسٹر کی تفتیش کرو۔ لیکن اگر آپ یہی مطالبہ اس وقت کرتے جب یہ لوگ (۱۹۷۰ء میں) انتخابات کے لئے بطور امیدوار کھڑے ہوئے تھے، تو نہ یہ ملک تباہ ہوتا اور نہ ہی آپ اس عذاب میں مبتلا ہوتے۔ اور یہ کچھ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے ساتھ مخصوص نہیں۔ جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی کہا ہے یہاں شروع ہی سے ایسا انداز چلا آ رہا ہے۔ جو لوگ برسرِ اقتدار آنا چاہتے ہیں، ہم ان کی انکوائری نہیں کرتے۔ لیکن جب وہ اقتدار سے برطرف ہو جاتے ہیں تو ان کی انکوائریاں کراتے پھرتے ہیں۔ ان انکوائریوں سے فائدہ کیا ہوتا ہے؟ اگر یہ لوگ مجرم ثابت ہو جاتے ہیں تو انہیں کچھ سزا مل جاتی ہے۔ لیکن کیا اس سے ان بے پناہ نقصانات کی تلافی ہو جاتی ہے جو وہ ملک اور مملکت کو پہنچا چکے ہوتے ہیں؟ اور تماشا یہ کہ ہم اِن کی تو انکوائریاں کراتے ہیں لیکن جو ان کی جگہ لینے کے لئے آگے بڑھتے ہیں ان کی انکوائریوں کی ہم کوئی ضرورت نہیں سمجھتے۔ بلا دیکھے بھالے، آنکھ بند کرکے، ان کے حق میں ووٹ دے کر انہیں برسرِ اقتدار لے آتے ہیں اور

جب وہ تباہی مچا چکتے ہیں اور اقتدار ان سے چھن جاتا ہے تو ان کی انکوائریوں کا مطالبہ شروع کر دیتے ہیں! اصل یہ ہے کہ اس قسم کی انکوائریوں کے مطالبہ کے پیچھے جذبہ یہ کارفرما ہوتا ہے کہ اس سے قوم اپنے آپ کو یہ (جھوٹا) اطمینان دلا لیتی ہے کہ ان تباہیوں کے ذمہ دار ہم نہیں۔ یہ لیڈر ہیں۔ قوم اس خود فریبی میں مبتلا ہو جاتی ہے، اور اس کے بعد اقتدار پھر ایسے لوگوں کے سپرد کر دیتی ہے جن کے متعلق کوئی تحقیق و تفتیش نہیں کی ہوتی۔ جب وہ بھی وہی کچھ کرتے ہیں تو پھر یہ چیخنے چلّانے لگ جاتی ہے۔ اس ضمن میں قرآن کریم ایک ایسا اصول بطور رہنمائی دیتا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے قوم اس قسم کی تباہیوں سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ حضورؐ نبی اکرم نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ یہ بڑا عظیم دعویٰ تھا۔ قوم نے آپؐ سے کہا کہ اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ آپؐ اس دعوے میں سچے ہیں۔ جھوٹ نہیں بولتے۔ دھوکا نہیں دیتے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس سوال کے جواب میں حضورؐ نے اپنی صداقت کے ثبوت میں کونسی شہادت پیش کی! آپؐ نے فرمایا کہ:۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ۔ (۱۰/۱۶)

میں تم میں اجنبی نہیں۔ کہیں باہر سے نہیں آیا۔ میں نے اس دعوے سے پہلے (مِنْ قَبْلِهِ) تمہارے اندر اپنی عمر بسر کی ہے۔ تم میری سابقہ زندگی پر غور کرو اور پھر جذبات سے الگ ہٹ کر عقل و فکر کی رو سے فیصلہ کرو کہ کیا اس قسم کی زندگی جھوٹوں کی ہوتی ہے یا سچوں کی!

آپ نے غور فرمایا کہ اس میں اصول کیا پیش کیا گیا ہے۔ یہ کہ ہر مدعی کے ماضی (سابقہ زندگی) کو سامنے لاؤ اور اس سے پرکھو کہ اس کا کیریکٹر کس قسم کا ہے۔ حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم مجھے نبی تسلیم کر لو اور اس کے بعد دیکھو کہ میں کس قسم کا انسان ثابت ہوتا ہوں۔ فرمایا یہ کہ تم میری سابقہ زندگی پر غور کرو اور اس سے اندازہ لگاؤ کہ میں کس قسم کا انسان ہوں۔ میرا کیریکٹر کس قسم کا ہے۔ اگر ہم اس اصول کو اپنے سامنے رکھ لیں اور اس کے مطابق فیصلہ کریں کہ جو شخص کسی منصب یا اقتدار کے لئے آگے آتا ہے، اس کی سابقہ زندگی اُس کے متعلق کیا کہتی ہے، تو ہم ان تباہیوں سے بچ جائیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کے باوجود بعض افراد ایسے نکل آئیں گے جو اختیارات ہاتھ میں آنے کے بعد بدعنوانیاں کرنے لگ جائیں۔ لیکن یہ مستثنیات ..... (EXCEPTIONS) ہوں گی۔ اور جب یہ ان لوگوں کے ساتھ کام کریں گے جن کی اکثریت دیانتداروں پر مشتمل ہوگی، تو انہیں بدعنوانیوں پر اترنے کی جرأت نہیں ہوگی۔ فرد کے لئے اس کے رفقاء کا کردار بڑا مؤثر ہوتا ہے، اور لغزشوں کی روک تھام کا موجب۔ اسی لئے قرآن مجید نے کہا ہے کہ: كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ۔ (۹/۱۱۹) سچوں کی رفاقت اختیار کرو۔

کسی شخص کے ماضی کے کردار کو پرکھنے کے لئے ہمارے صدر اوّل کے معاشرہ نے ہمارے لئے بڑی برجستہ مثالیں چھوڑی ہیں۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے، ایک شخص سے کہا کہ وہ اپنے دعوے کی تائید میں کسی قابلِ اعتماد آدمی کو پیش کرے۔ اس نے ایک آدمی کا نام لیا تو آپ نے پوچھا کہ:۔

کیا تم نے اس کے ساتھ کبھی سفر کیا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔

پھر پوچھا۔ کیا تم کبھی اس کے ہمسایہ رہے ہو؟ اس نے کہا نہیں۔

آپ نے پھر پوچھا۔ کیا اس کے ساتھ تمہارا کبھی کوئی معاملہ پڑا ؟
جب اس نے اس پر بھی کہا کہ نہیں، تو آپ نے فرمایا کہ :-

پھر تم اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اسے مسجد میں سر جھکاتے، سر اٹھاتے دیکھ لیا اور اس سے سمجھ لیا کہ وہ قابلِ اعتماد ہے۔ (شاہکار رسالت ص۲۴۴)

اس قسم کی تحقیق، فردِ متعلقہ کی ذات تک ہی محدود نہیں رہنی چاہیئے۔ اس کے اہلِ خانہ کو بھی محیط ہونی چاہیئے۔ حضرت عمرؓ کا دستور تھا کہ :-

جب لوگوں کو کسی بات سے منع کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کرکے ان سے کہتے کہ میں نے لوگوں کو فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے۔ یاد رکھو! لوگ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جس طرح پرندہ گوشت کی طرف دیکھتا ہے۔ اگر تم بچو گے تو وہ بھی بچیں گے۔ اور اگر تم پھنسو گے تو وہ بھی پھنسیں گے اگر تم میں سے کسی نے ان باتوں کا ارتکاب کیا تو خدا کی قسم! میں اپنے ساتھ تمہارے تعلق کی وجہ سے تمہیں دگنی سزا دوں گا۔ اب تمہیں اختیار ہے۔ جو چاہے حدود سے تجاوز کرے۔ جو چاہے ان کے اندر رہے۔ (شاہکارِ رسالت۔ ص۲۹۷)

اہلِ خانہ ہی کو نہیں۔ اس میں اس کے دوستوں کو بھی شامل کرنا چاہیئے۔ "حضرت عمرؓ نے ایک شخص سے کہا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اس نے جواب میں کہا کہ ایسا نظر آتا ہے کہ آپ میرے حقوق میں کچھ کمی کرنا چاہتے ہیں اس لئے معاف فرمایئے۔ مجھے اپنا دوست نہ بنایئے۔ دور دور ہی رہنے دیجئے۔" (ایضاً۔ ص۲۴۹)

حضرت عمرؓ کا یہ اصول بھی یاد رکھئے کہ :-

جو شخص شر پیدا کرکے غالب آیا، وہ غالب نہیں مغلوب ہے۔ جس نے ناجائز طریق سے کامیابی حاصل کی، وہ کامیاب نہیں ناکام ہے۔ (ایضاً۔ ص۴۳۵)

جس شخص کو کسی منصب کے لئے منتخب کرنا مقصود ہو اس کے متعلق دیکھو کہ کیا وہ اس معیار پر پورا اترتا ہے کہ :-

جب وہ اس منصب پر فائز ہو تو وہ اپنی قوم کا سردار نظر آئے۔ اور جب اسے قوم کا سردار بنا دیا جائے تو وہ انہی میں کا ایک فرد معلوم ہو۔ (ایضاً۔ ص۲۸۵)

انتخاب کے امیدواروں کے ماضی کو اس قسم کے معیاروں کے آئینے میں پرکھو اور جب وہ شرافت، عصمت، دیانت، امانت، حسنِ معاملہ، انصاف، عدل، وسعتِ قلب، کشادگیٔ ظرف، استغناء وغیرہ کے اصولوں پر پورے اتریں تو پھر انہیں اس قابل سمجھو کہ انہیں اختیار و اقتدار سونپا جا سکتا ہے۔ اس قبل از وقت، انکوائری کے بعد آپ کو نہ تو بعد میں چیخنا چلّانا پڑے گا اور نہ ہی انکوائری کمیٹیاں بٹھانے کی ضرورت لاحق ہوگی۔ اس قسم کی انکوائری کے لئے عملی پروگرام یہ ہونا چاہیئے کہ انتخابات کی تاریخ سے کم از کم تین چار ماہ قبل، امیدواروں کی فہرستیں (قواعد و ضوابط کی رو سے) مکمل ہو کر شائع ہو جائیں۔ اس تین ماہ کے عرصہ میں، متعلقہ حلقۂ انتخاب کے رائے دہندگان کا فریضہ ہو کہ وہ اپنے اپنے حلقہ کے امیدواروں کی ماضی کی زندگی کی پوری پوری چھان پھٹک کریں۔ اس سلسلہ میں، انہیں حکومت بھی مطلوبہ معلومات فراہم کرے (ضابطۂ انتخابات

ہیں، حکومت پر ایسا کرنے کی پابندی ہونی چاہیئے، بشرطیکہ اس میں کوئی قانونی موانعات نہ ہوں)۔ اس کے بعد رائے دہندگان، اپنے معیاری امیدوار کے حق میں ووٹ دیں اور ایسا کرتے وقت، اس نوعیت کا حلف نامہ داخل کریں کہ انہوں نے اس امیدوار کے ماضی کے متعلق اپنا پورا پورا اطمینان کر لیا ہے۔ انتخابات کے بعد بھی ایک مستقل کمیشن موجود رہنا چاہیئے جس کا فریضہ ہو کہ جس ممبر کے خلاف کوئی الزام عائد ہو، اس کی بلا تاخیر تحقیقات کرے، اور اگر وہ الزام صحیح ثابت ہو جائے تو اسے رکنیت سے برطرف کر دے، اور آئندہ کے لئے نااہل قرار دے دے۔ اس طرح ساتھ کے ساتھ عملِ تطہیر سے ملک بہت سی تباہیوں سے بچ سکتا ہے۔

لیکن ہمارے ہاں "سیاسی ضابطۂ اخلاق" کا معیار بھی نرالا ہے۔ ایک صاحب اقتدار، کھلے بندوں بدعنوانیوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس کے گھناؤنے جرائم زبان زدِ خلائق ہوتے ہیں۔ اس کے ذاتی کردار کے چرچے عام ہوتے ہیں۔ مخالف پارٹی اس کے خلاف تحقیقات کے مطالبے کرتی ہے۔ لیکن ایک صبح وہ اپنی پارٹی کو چھوڑ کر اسی مخالف پارٹی میں شامل ہو جاتا ہے تو اسے سر آنکھوں پر بٹھا لیا جاتا ہے۔ اسے پارٹی کے بلند ترین منصب پر سرفراز کر دیا جاتا ہے۔ اس کے سب عیب، ہنر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اسے قوم کا ہیرو بنا کر دکھایا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس قسم کے افراد ہی نہیں، ایسی سیاسی پارٹیاں بھی سیاست میں حصہ لینے کی نااہل قرار دی جانی چاہئیں جن پارٹیوں کا معیارِ اخلاق یہ ہو کہ اپنی پارٹی میں شامل ہر غنڈہ اور بدمعاش، انتہائی شریف اور نیکوکار، اور مخالف پارٹی کا ہر فرد، غنڈہ اور بدمعاش اور پھر پارٹی بدل لینے کے ساتھ ہی بد، نیک۔ اور نیک، بد بن جائے۔ ایسی پارٹیاں کس طرح قابلِ اعتماد ہو سکتی ہیں!

اس دفعہ انتخابات کے سلسلہ میں اثاثوں کی تحقیقات کا عمل بھی شروع کیا گیا ہے۔ یہ بڑا مبارک اقدام ہے بشرطیکہ ان تحقیقات پر کوئی جانبدارانہ جذبہ اثر انداز نہ ہو۔ لیکن ضرورت اس سے ایک قدم آگے جانے کی ہے۔ ہمارے ہاں بددیانتی (CORRUPTION) سے بالعموم مراد روپے پیسے کی بددیانتی ہوتی ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن کیریکٹر صرف روپے پیسے کے معاملہ میں دیانتداری کا نام ہی نہیں۔ کیریکٹر تو زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہوتا ہے ـــــ افراد کے خیالات، جذبات، عزائم، ارادے، نفسیاتی رجحانات وغیرہ سب اس میں آ جاتے ہیں۔ ایک شخص روپے پیسے کے معاملہ میں تو دیانتدار ہے، لیکن جھوٹا۔ منافق۔ خوشامدی۔ جاہ پرست۔ تنگ نظر۔ حاسد۔ کمینہ فطرت ہے۔ ایسے شخص کے ہاتھ میں اقتدار سونپ دینا، کچھ کم تباہی کا موجب نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک معنی میں دیکھئے تو ایسا شخص، روپے پیسے کے معاملہ میں بددیانت آدمی سے بھی زیادہ نقصان رساں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ مالی نقصان کا ازالہ تو ممکن ہے لیکن اس قسم کا صاحب اقتدار قوم کو جس قسم کا نقصان پہنچا جاتا ہے، اس کی تلافی ممکن نہیں ہوتی۔ وہ تو معاشرہ کے سارے تالاب کو گندہ کر جاتا ہے۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا ہے کہ قرآنِ مجید میں جرائم کا ذکر تو ایک آدھ بار آتا ہے لیکن منافقین کی تباہ کاریوں کے تذکرہ اور ان سے محتاط رہنے کی تاکیدات سے آدھا قرآن بھرا پڑا ہے۔

طلوع اسلام ذاتیات پر نہیں اترا کرتا، بجز اس کے کہ کسی اصولی نکتہ کی وضاحت کے لئے ایسا کرنا ناگزیر ہو جائے، ورنہ ہم نام لے لے کر بتائے کہ کس طرح ایک شخص (مثلاً) پیپلز پارٹی کے یوم تاسیس سے اس کے اندرونی حلقہ میں ممتاز حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ برسوں اس کے ساتھ رہتا ہے۔ بلند ترین مناصب و مدارج پر فائز ہوتا ہے۔ پارٹی کے ہر اہم فیصلہ اور اقدام میں کبھی شریک اور کبھی مشیر ہوتا ہے۔ جلوت و خلوت میں مسٹر بھٹو کا رازداں ہوتا ہے۔ اس تمام دوران میں، پیپلز پارٹی کو بالعموم اور مسٹر بھٹو کو بالخصوص ملک کے لئے آیۂ رحمت اور قوم کے لئے سایۂ عاطفت قرار دیتا ہے۔ اپنے قائد کے جمال کو نوشیروانی عدل کا عکاس اور اس کے جلال کو اسد اللہی شمشیر کا آئینہ دار بتاتا ہے۔ وہ برسوں اس قسم کی قصیدہ خوانی میں مصروف نشید رہتا ہے۔ تاآنکہ وہ ایک دن اپنے منصب سے الگ کر دیا جاتا ہے تو جھٹ سے مخالف پارٹی میں جا ملتا ہے اور ببانگ دہل آواز دیتا ہے کہ آؤ لوگو! میں تمہیں بتاؤں کہ پیپلز پارٹی کس طرح ڈاکوؤں اور لٹیروں کی جماعت ہے۔ اور اس کا لیڈر کتنا بڑا فرعون، نمرود، شداد اور یزید ہے۔ اور اس کے بعد وہ گلی گلی، کوچہ کوچہ، ان دہشت انگیز جرائم کی نقاب کشی کرتا ہے جن کا (بقول اس کے) اس پارٹی کی طرف سے، اس عرصہ میں ارتکاب ہوا تھا، جس عرصہ میں وہ خود اس پارٹی میں شریک تھا۔ قوم، اس کی بیان کردہ وحشت و بربریت کی داستانوں کو مزے لے لے کر سنتی ہے، اور اس سے کوئی اتنا نہیں پوچھتا کہ یہ سب داستانیں اس دور سے متعلق ہیں جب آپ خود اس پارٹی کے اندرونی حلقہ میں شامل تھے، اس لئے اگر آپ ان جرائم کے ارتکاب میں خود شریک نہیں تھے، تو کم از کم ان کے رازدان تو تھے، لہٰذا آپ ؎

بچتے نہیں مواخذۂ روز حشر سے قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

اگر آپ ان رازہائے درونِ پردہ کا انکشاف اس وقت کرتے جب یہ پہلی مرتبہ آپ کے علم میں آئے تھے تو قوم اُن سے بروقت متنبہ ہو جاتی اور ان کے تدارک کی کوئی تدبیر سوچ لیتی۔ آپ برسوں ان خفیہ جرائم کو ہوتا دیکھتے رہے، اور نہ صرف یہ کہ قوم کو ان سے خبردار نہ کیا، بلکہ ان کے مرتکبین کے حق میں مدح و ستائش کے قصائد پڑھتے رہے اور اس طرح قوم کو فریب دیتے رہے۔ آج آپ اپنے آپ کو بری الذمہ کیسے قرار دے سکتے ہیں؟

اتنا ہی نہیں کہ قوم میں سے کوئی ایسے لوگوں سے یہ سوال نہیں پوچھتا، بلکہ جس پارٹی میں یہ شامل ہو جاتے ہیں، وہ انہیں قوم کا ہیرو بنا کر پیش کرتی ہے! آپ سوچئے کہ اگر کل کو اس قسم کی پارٹی اور اس میں شامل اس قسم کے کیریکٹر کے افراد برسر اقتدار آ جائیں، تو یہ کیا کچھ نہیں کریں گے؛ جرم کے مرتکب ہی مجرم نہیں ہوتے۔ جرائم کی پردہ پوشی کرنے والے اور ایسے لوگوں کو ہیرو قرار دینے والے سب زمرۂ مجرمین میں شامل کئے جانے کے قابل ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر آپ نے افرادِ قوم کے ماضی کی چھان بین کرنی ہے تو اسے روپے پیسے تک محدود نہ رکھئے، ان کے اس قسم کے اعمال کی بھی چھان بین کیجئے کہ ان کے صحیح کیریکٹر کی پرکھ اسی سے ہو سکے گی۔

ہم نے بات شروع کی تھی خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت سے۔ اس مواخذہ میں صورت یہ ہوتی ہے کہ اگر ایسے فرد، پارٹی یا قوم میں بازآفرینی کی صلاحیت باقی نہ رہی ہو تو اس کی تباہی ابدی ہو جاتی ہے۔ وَجَعَلْنٰهُمْ

اَحَادِیْثَ ۔ (۲۳/۴۴) اس کے بعد ان کی صرف داستانیں باقی رہ جاتی ہیں کہ وہ آنے والی قوموں کے لئے آیۂ عبرت بنیں۔ لیکن اگر ان میں ہنوز زندہ رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے تو خدا کا قانون انہیں ایک اور موقعہ دیتا ہے کہ وہ اپنی سابقہ غلط کاریوں پر پشیمان ہوں۔ آئندہ کے لئے ان سے مجتنب رہنے کا عہد اور عزم کریں۔ اور سابقہ نقصانات کی تلافی۔ اس تلافی کی اس نے ایک ہی صورت بتائی ہے۔ اور وہ یہ کہ: اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (۱۱/۱۱۴) تخریب کاری کے نتائج کی تلافی صرف اس طرح ہو سکتی ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ تعمیری کام کرے۔ اسی کو قرآنی اصطلاح میں تَابَ وَ اَصْلَحَ کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد ہم دو لفظ اس گروہ سے بھی کہنا چاہتے ہیں جو سابقہ پارٹی کی جگہ برسرِ اقتدار آنے کے لئے کوشاں ہے۔ اور وہ دو لفظ یہ ہیں کہ اس وقت آپ میں اور سابقہ برسرِ اقتدار پارٹی میں فرق صرف اتنا ہے کہ انہیں اقتدار کے استعمال کرنے کا موقعہ مل گیا تھا اور آپ کو ابھی وہ موقعہ نہیں ملا۔ اس فرق سے آپ اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونے دیں کہ سابقہ برسرِ اقتدار پارٹی عیوب کا مجسمہ تھی اور آپ کا گروہ پاکبازوں پر مشتمل ہے۔ اگر آپ برسرِ اقتدار آنے کے بعد، عبرتناک انجام سے بچنا چاہتے ہیں تو اپنے گروہ میں شامل افراد کا ابھی سے محاسبہ کیجئے اور صرف ان لوگوں کو اپنے سامنے رکھئے جن کا ماضی آئینہ کی طرح شفاف ہو۔ یاد رکھئے! قانونِ خداوندی کی رو سے، اقتدار عیش سامانیوں کا ذریعہ نہیں ہوتا۔ وہ قوموں اور جماعتوں کے کیریکٹر کے پرکھنے کی کسوٹی ہوتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالےٰ نے آنے والوں سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:-

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ۔ (۱۰/۱۴)

(ان جانے والوں کے بعد) ہم نے تمہیں اقتدار دیا تاکہ یہ دیکھیں کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو؟

نہ ہی آپ عوام کے نعروں سے فریب میں آ جائیں۔ ہماری قوم کا شیوہ یہ ہے کہ یہ ہر آنے والے کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالتی ہے اور جب وہ جاتا ہے تو اسے جوتیوں سے نوازتی ہے ..... اُسے جوتیوں سے نوازتی ہے اور آنے والے پر پھول نچھاور کرتی ہے اور اس کے جانے پر اس سے بھی وہی سلوک کرتی ہے جو سابقہ جانے والے کے ساتھ کیا تھا۔ آپ اپنے ملک کی تیس سالہ تاریخ پر نگاہ ڈالئے اور اس آمد و رفت کے مناظر کو سامنے لائیے۔ وہ انہی پھولوں اور جوتیوں کا مرقع نظر آئیں گے۔ سعدی نے اسی لئے کہا تھا کہ: ؎

اے دوست بر جنازۂ دشمن چو بگذری شادی مکن کہ باتو ہمیں ماجرا رود

اگر ہمارے ہاں کے آنے جانے۔ اور جانے، آنے والے اس نکتہ کو سمجھ لیں، اور قوم اس حقیقت سے واقف ہو جائے کہ پھولوں کے ہار اسی گردن میں ڈالنے چاہئیں جو اس کی مستحق ہو، تو آج قوم کا نصیبہ جاگ اُٹھے۔

لیکن ایسا شعور تو قرآنی اقدار کی تعلیم اور اس کے مطابق تربیت سے بیدار ہوتا ہے، اور اسے کوئی درخورِ توجہ نہیں سمجھتا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہاں مسلسل کوشش یہ چلی آ رہی ہے کہ سادہ دل مسلمان: ؎

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

اور اس کا کسی کو احساس ہی نہیں کہ: اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِیْدٌ (۸۵/۱۳) "تیرے رب کے قانونِ مکافات کی گرفت کتنی سخت ہوتی ہے"۔

ان دنوں ایک اور اہم سوال بھی بار بار دلوں میں ابھرتا اور اکثر زبانوں پر آجاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ہمارے ہاں وہ بنیادی نقص کیا ہے جس کی وجہ سے یہاں کوئی حکومت پائیدار نہیں رہتی۔ کسی آئین کو استحکام نصیب نہیں ہوتا آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ان تبدیلیوں کے نتیجہ میں فسادات رونما ہوتے ہیں اور پھر فوج کو بار بار مداخلت کرنی پڑتی ہے۔ ان ہچکولوں اور زلزلوں سے مملکت کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ اس مسلسل گردشِ دولابی سے قوم کی حالت یوں ہو رہی ہے گویا یہ ایسی کشتی پر سوار ہے جو طوفان آمیز موجوں کے تلاطم میں گھر چکی ہو اور اسے دھڑکا لگ رہا ہو کہ یہ اب ڈوبی کہ اب۔

یہ سوال بڑا اہم ہے اور گہرے تفکر و تدبر کا محتاج۔ تقسیمِ ہند سے پہلے ہمارے ہاں کیفیت یہ تھی کہ ملک میں ایسے اربابِ فکر و تدبر بکثرت موجود تھے جو ہنگامہ آرائیوں میں حصہ نہیں لیتے تھے اور ملت سے متعلق اہم معاملات پر، نہایت سکون و سکوت کے ساتھ غور و فکر کر کے، قوم کو راہ نما اصولوں سے بہرہ یاب کر دیتے تھے ـــــ ملک تو وسیع و عریض تھا۔ ایک پنجاب، بلکہ اسی شہر لاہور میں اس قسم کے اربابِ دانش و بینش کتنے ہی موجود تھے، لیکن تشکیلِ پاکستان کے بعد، ہنگامی سیاست اس قدر عام ہو گئی کہ اس قسم کے خاموش دیدہ وروں کی اہمیت کم ہوتی گئی اور یوں محسوس ہونے لگا گویا قوم کو ان کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ نتیجہ اس کا یہ کہ آہستہ آہستہ ان کا وجود ہی ختم ہو گیا اور قوم ایسے قافلہ کی طرح ہو گئی جس کا میرِ کارواں کوئی نہ ہو۔ علامہ اقبالؒ نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ جو قوم فکری راہ نمائی سے محروم ہو جائے وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ قوم اسی محرومی کا شکار ہو چکی ہے۔ طلوعِ اسلام انہی خاموش مفکرین کی یادگار ہے۔ علیٰ قدرِ وسعت اپنا فریضہ ادا کئے جا رہا ہے۔ اور تند و تیز ہواؤں میں بھی کوشش کر رہا ہے کہ یہ چراغ بجھنے نہ پائے۔ وما توفیقی الا باللّٰہ العلی العظیم۔

ہماری بنیادی خرابی یہ ہے کہ ہم نے مغربی جمہوریت کو بلا سوچے سمجھے اپنا نظامِ سیاست قرار دے رکھا ہے، حالانکہ ـــــ علاوہ اس کے کہ یہ اسلامی نظامِ سیاست کے یکسر خلاف ہے ـــــ یہ ہمارے حالات کے بھی موافق نہیں۔ برطانیہ اور امریکہ میں صدیوں سے قوم کی سیاسی تربیت ہوتی چلی آ رہی ہے اس لئے وہاں جمہوری نظام، نسبتاً ہمواری کے ساتھ چلتا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں سیاسی تربیت تو ایک طرف، قوم کا سیاسی شعور تک بیدار نہیں۔ اس لئے یہاں مسلسل تلاطم خیزیاں برپا ہوتی رہتی ہیں۔ اس ضمن میں آپ ایک بنیادی نکتہ پر غور فرمایئے۔ ہمارے آئین میں اس سوال کے متعلق بڑی تفصیل کے ساتھ بحث ہوتی ہے کہ مملکت کا اقتدار کن لوگوں کے ہاتھ میں دیا جائے ـــــ قومی اور صوبائی مجالس قوانین ساز، اور سینٹ کی نشستیں۔ نشستوں کی تقسیم (الاٹ منٹ)۔ ان کے لئے امیدواری کی شرائط۔ ووٹروں کی خصوصیات۔ معینہ مدت کے بعد انتخابات۔ ان انتخابات کے لئے لمبے چوڑے انتظامات۔ پارلیمان کے متعلق قواعد و ضوابط اور حدود و قیود۔ کابینہ کا تعین۔ صدرِ مملکت اور وزارتِ عظمیٰ کے اختیارات۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان امور سے متعلق آئین میں وسیع پیمانے پر ہدایات اور احکامات موجود ہوتے ہیں۔ لیکن اس میں اس امر کے لئے کوئی مؤثر طریق کار نہیں ہوتا کہ اگر برسرِاقتدار پارٹی بدعنوانیوں پر اُتر آئے اور قوم اس سے تنگ آجائے تو اسے اقتدار سے الگ کیسے کیا جائے! آئین میں اتنا ہی کہا جاتا ہے کہ پارلیمان کی اس قدر اکثریت (دو تہائی اور بعض صورتوں میں سادہ اکثریت) عدمِ اعتماد کا ووٹ پاس کر کے صدر یا وزیرِاعظم کو الگ کر سکتی ہے۔ اور وزیرِاعظم کی علیحدگی سے اس کی کابینہ

خود بخود الگ ہو جاتی ہے۔ لیکن اس طریقِ کار میں بنیادی خرابیاں ہیں۔ پہلی خرابی تو یہ کہ اس میں قوم بے دست و پا ہوتی ہے۔ عدمِ اعتماد کا ووٹ ارکانِ اسمبلی ہی پاس کرسکتے ہیں۔ قوم ہزار چیختی چلّاتی رہے، اگر اسمبلی کے ارکان ایسا ووٹ پاس نہیں کرتے تو قوم کچھ نہیں کرسکتی۔ اور دوسری خرابی یہ کہ اگر برسرِاقتدار پارٹی دو تہائی اکثریت کی حامل ہو، تو بے اعتمادی کا ووٹ پاس ہی نہیں ہو سکتا۔ قوم کو، اُن ارکان کے ہاتھوں جنہیں اس نے اپنے نمائندے منتخب کیا تھا، ایک معینہ مدت تک کے لئے، مبتلائے عذاب رہنا پڑتا ہے۔ قوم کی یہ بے بسی ہے جس سے اس کے سینے میں غصہ اور انتقام کے جذبات اُبھرتے ہیں اور جب ان کی تسکین کی کوئی آئینی صورت نظر نہیں آتی تو وہ آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح فسادات بن کر معاشرہ کو تہ و بالا کر دیتے ہیں۔ یہ نفسیات کا مسئلہ ہے کہ جن جذبات کے باہر آنے کے لئے فطری راستے مسدود ہو جائیں، وہ اپنی نمود کے لئے غیر فطری راہیں تراش لیتے ہیں۔ غالبؔ کے الفاظ ہیں :-

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع، تو ہوتی ہے رواں اور

ملک میں آئے دن کی ہنگامہ خیزیوں کے روکنے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ قوم کو اس مقام تک نہ لے جایا جائے جہاں وہ تغیّرِ احوال کے لئے اپنے آپ کو بے دست و پا، مجبور پائے۔

یہ ہے ہمارے ہاں کی وہ بنیادی خرابی جس کی وجہ سے یہاں آئے دن ہنگامے برپا ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ:۔

(۱) جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے، اپنے نمائندگان کو چُننے وقت قوم، ان کے ماضی کو چھان پھٹک کر، ان کی دیانت و امانت اور شرافت و نجابت کی طرف سے اچھی طرح مطمئن ہو جائے۔ اور

(۲) اس کے بعد ایسی صورت نہ پیدا ہونے دی جائے کہ وہ جو جی میں آئے کرتے رہیں، قوم ان کا کچھ بگاڑ ہی نہ سکے۔ وہ (نمائندگان) معینہ مدت تک، بہرحال قوم کے سر پر سوار رہیں۔

یہ دوسرا مسئلہ ایسا ہے جس کے لئے قوم کے اربابِ دانش کو مل بیٹھ کر سوچنا چاہیئے کہ آئین میں کس قسم کی تبدیلی کی جائے جس سے قوم، اپنے نمائندوں کو منتخب کرکے، ایک مدتِ معینہ تک بے دست و پا ہو کر نہ رہ جائے بلکہ جس وقت دیکھے کہ ان نمائندوں کو قوم کا اعتماد حاصل نہیں رہا، قوم انہیں آئینی طور پر الگ کرسکے۔ اس تبدیلی کی عملی صورت کیا ہو، یہ بات اربابِ دانش و بینش کے سوچنے کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے قوم کے مقرر کردہ، ایسے ادارۂ احتساب کی ضرورت ہوگی جو (۱) پارلیمان وغیرہ سے الگ ہو۔ (۲) جس کے کان قوم کی آواز پر، اور نگاہیں اربابِ اقتدار کے اعمال و کردار پر ہوں۔ اور (۳) جب وہ قوم کے تقاضے کو محسوس کرے تو برسرِ اقتدار طبقہ کو اقتدار سے الگ کرسکے۔ اور اگر اسے اس مقصد کے لئے ضرورت پڑے تو فوج کی مدد بھی حاصل کرسکے ——— یہ اصولی سے خطوط ہیں جو اس مقصد کے لئے سردست ہمارے ذہن میں آتے ہیں۔ اس کا حتمی فیصلہ اربابِ دانش و بینش کا وہ حلقہ کرے گا جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ اگر پاکستان کا کوئی بہی خواہ، اس حلقہ کی تشکیل کے لئے عملی جد و جہد کرے تو وہ قوم کا بہت بڑا محسن ہوگا۔ اس کیلئے اس قسم کے اعتراضات کو آڑے نہیں آنے دینا چاہیئے کہ آئین میں ایسی شق نظامِ جمہوریت کے خلاف ہے۔ یاد رکھئے! مغرب کا نظامِ جمہوریت منزّل من اللہ نہیں جو اس میں کسی قسم کی تبدیلی کو کفر و الحاد سمجھ لیا جائے۔ ہمیں اپنے حالات کے مطابق آئین مرتب کرنا چاہیئے نہ کہ مغرب کی کورانہ تقلید میں بہے جانا چاہیئے۔